ورق ورق روشن

(مضامین)

میر غلام رسول نازکیؔ

ترتیب و پیشکش

ایاز رسول نازکی

ورق ورق روشن

(مضامین میر غلام رسول نازکیؔ)

ترتیب و پیشکش

ایاز رسول نازکی

© حقوق محفوظ

نام کتاب	:	**ورق ورق روشن**
مصنّف	:	میر غلام رسوٗل نازکی
سالِ طباعت	:	۲۰۱۴ء بارِ اوّل
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	عادل اسماعیل
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	۳۰۰ روپیہ
مطبع	:	مہک پرنٹنگ پریس، سرینگر 9419063159

فہرست

صفحہ نمبر	عنوان	شمار نمبر
1	پیش لفظ	01
3	حضرت میر نازک نیازی قادریؒ	02
15	غبارِ کارواں	03
26	نعتیہ ادب۔ (۱)	04
38	نعتیہ ادب۔ (۲)	05
62	سیرتِ رسولؐ دعاؤں کی روشنی میں	06
73	قرآنِ مجید اور نعتِ رسولؐ	07
83	اسلام میں تصوّرِ جمال	08
96	نفسِ امارہ	09
99	نفسِ لوامہ	10

11	نفس مطمئنہ	103
12	تصوّرِ انقلاب اور معرکہ کربلا	107
13	اسلام اور مشترکہ قومیت کا تصوّر	114
14	وہ ایک سجدہ......	140
15	اورنگ زیب عالمگیر	149
16	حسن شاہ اور اس کا زمانہ	177
17	کشمیری شاعری	197
18	خواجہ غُلام السیدِین	213
19	سارے گِلے تمام ہوئے	226
20	ستاروں سے ذرّوں تک	233

☆

انتساب

ان تمام کشمیریوں کے نام جنہوں نے
ہر دور میں کشمیر کی عظیم علمی اور فنّی
روایات قائم رکھیں!

پیش لفظ

والدِ محترم نے اپنے انتقال سے چند ماہ پیشتر مجھ سے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ اُن کے مضامین کتابی صورت میں شائع ہوجاتے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے مرحوم شمس الدین شمیم کا ذکر کیا، اُن کی کوششوں سے چند ایک مضامین حاصل ہوچکے ہیں۔ والد نے یہ دو تین مضامین یہ کہہ کر میرے حوالے کیئے ''ووٗنی یہِ خوش گٔری تہٕ گٔری زبکھ'' اب جو آپ چاہیں کیجئے گا۔ اُٹھتے بیٹھتے تب سے برابر یہی فکر دامن گیر رہا کہ کسی طرح سے اُن کی یہ خواہش پوری ہوجائے۔ اِس اثناء میں اگر چہ کلچرل اکادمی کے شیرازہ کا میر غلام رسول نازکی نمبر اور پھر تحریک ادب بنارس کا نازکی نمبر بھی شائع ہوئے اور دونوں میں والد محترم کے بیشتر مضامین شامل اشاعت ہوئے، مگر پھر بھی ایک خلش سی تھی کہ کسی طرح سے اس ذمہ واری سے عہدہ برآ ہوسکوں۔ بہر حال اس مجموعے میں اُن کے چھوٹے

بڑے 19 مضامین شامل ہیں۔ اِن میں چار ایسے مضامین بھی ہیں جن کے برادرم بشیر عارف، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو نے آڈیو فراہم کیئے۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بیشتر مضامین کلچرل اکادمی کے مجلّے شیرازہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں۔ میں اکادمی کا بھی احسان مند ہوں۔ عزیزم عادل اسماعیل نے اس کتاب کی تیاری خاص کر آڈیو فائلز کو کاغذ پر منتقل کرنے میں کافی محنت کی۔ اللہ اُنکو اس کا اجر دے۔

مجھے اُمید ہے کہ نازکی صاحب کے چاہنے والوں اور اُردو نثر کے ساتھ شغف رکھنے والوں کو یہ کتاب بے حد پسند آیئے گی۔

ایاز رسول نازکی
یکم اپریل، 2014

حضرت میر نازک نیازی قادریؒ

سلطان زین العابدین کا عہد حکومت نہ صرف اس لحاظ سے کشمیر کا عہدِ زریں کہلاتا ہے کہ ان کے زمانے میں کشمیر صنعت و حرفت کا گہوارہ بنا بلکہ ملک میں طویل بدامنی کے بعد امن و آشتی کا دور دورہ ہونے لگا۔ اس اعتبار سے بھی یہ عہد سنہرا عہد ہے کہ کشمیر میں علم و فضل، خداشناسی، بصیرت و معرفت کا آفتاب عالم تاب روشن ہوا۔ سلطان نے دیگر ممالک خاص کر چین اور روسی ترکستان سے رابطہ قائم کر کے وہاں کے علماء فضلاء کو دعوت دے کر کشمیر میں آباد کیا۔ ان ہی بزرگوں میں ایک صاحب تاریخ کے اوراق پر ستارۂ صبح کی طرح درخشاں ہیں اور ان کا نام میر محمد علی محمد بخاری تھا۔ سلطان بڈشاہ نے ان کو ان کے علم و فضل اور معاملہ فہمی کی بناء پر ملکِ کشمیر کے نظامِ عدل کا سربراہ بنادیا تھا اور وہ قاضی القضاۃ

کے عہدۂ جلیلہ پر مامور تھے۔ میر محمد علی بخاری کا خاندان کشمیر میں پھولا پھلا اور ملک کے شعبۂ عدل پشت در پشت اس خاندان کے چارج میں رہا۔ اس خاندان کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے۔

ایں سلسلۂ علمائے ناب است

این خانہ تمام آفتاب است

اس خاندان کے مشہور و معروف بزرگ قاضی موسیٰ شہید بھی ہیں جن کے حالات تاریخ میں تفصیل کے ساتھ منضبط ہیں اور اسی خاندان کے چشم و چراغ حضرت میر نازک نیازی قادریؒ ہیں جو اپنے علم و فضل کے علاوہ زہد و تقویٰ، معرفتِ الٰہی اور عشقِ سرمدی کے متوالے تھے اور تمام تاریخ نویسوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کشمیر میں لاتعداد اولیاء، اصفیاء، علماء اور بزرگانِ دین ہیں مگر تقویٰ اور پرہیز گاری کے معاملے میں حضرت میر نازک نیازی قادریؒ کا کوئی ثانی نہیں۔ میر علیہ رحمہ کا شجرہ نسب یوں ہے۔

میر نازک نیازی قادری بن میر حاجی محمد قاضی بن میر کمال الدین بن میر سکندر بن میر اسحاق بن میر علی بخاری بڈشاہی رحمتہ اللہ علیہ۔

میر علیہ الرحمتہ کی تاریخ ولادت کے بارے میں کوئی ثقہ روایت نہیں، البتہ اتنا معلوم ہے کہ ان کے والد میر حاجی محمد قاضی حضرت محبوب العالم سلطان العارفین شیخ حمزہ کشمیریؒ کے ہم عصر تھے۔ ان کی کئی اولادیں ہوئیں تھیں مگر خورد سالی میں ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں تھیں۔ میر نازک جب تولد ہوئے تو ان کے

والد انہیں حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ کشمیریؒ کی خدمت میں لائے اور ان سے عرض کی کہ اس سے پہلے جو اولادیں ہوئیں وہ سن بلوغ پر پہنچنے سے قبل ہی اس دنیا سے کوچ کر گئیں اس لئے اس نومولد کو آپ کی خدمت بابرکت میں لایا ہوں اور اسے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ مولانا بہاؤالدین متو اپنی کتاب 'سلطانی' میں یہ واقعہ اس طرح درج کرتے ہیں۔

چوں تولد جناب پر شدند — درودیوار منوّر شدن
بدر رخشندۂ علم برزد — بلکہ خورشید معرفت سرزد
پدر از مہر روبرش آورد — بسوئے شیخ حمزہ سلطان برد
کیں سپر کردہ ام نیاز شما — اے تو محمود وایں ایاز شما

(ترجمہ: جب حضرت میر نازکؒ پیدا ہوئے تو ان کے نورِ معرفت سے درودیوار منور ہو گئے۔ ایسا لگا کہ جیسے چمکتا چاند ظاہر ہوا بلکہ ایک خورشید معرفت طلوع ہوا۔ باپ نے اسے گود میں اٹھایا اور کہا کہ اس بچے کو آپ کی خدمت میں بطورِ نذرونیاز لایا ہوں۔ آپ اگر سلطان محمود ہیں تو یہ بچہ آپ کا ایاز بن کر رہے گا۔)

اسی اعتبار سے میر علیہ رحمتہ کو میر نازک نیازی بھی کہتے ہیں۔ کچھ دیر یہ بچہ حضرت سلطانؒ کے سامنے رہا۔ اتنے میں باپ نے دیکھا کہ حضرت سلطان العارفینؒ کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور وہ سمجھے کہ شاید یہ بچہ بھی زیادہ دیر تک زندہ رہنے والا نہیں۔ حضرت سلطان العارفینؒ باپ کے شکوک سے آگاہ ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ بچہ عالمِ روحانی میں اتنا بلند مقام ہے کہ مجھے خوشی ہوئی کہ

یہ میرا مرید ہوگا۔ مگر جناب غوثِ صمدانی، محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانیؒ نے مداخلت فرمائی اور کہا کہ ہم اسے اپنے سلسلے میں لے رہے ہیں۔ مولانا بہاؤ الدین فرماتے ہیں۔

ایں پسر کہ ہما سپردہ تست | از پئے حق نثار کردۂ تست
ماچودیدیم نور قربت او | شاد گشتیم و داد فرحت او
یہ ردا یک برشوکت و شانش | دست بگرفتہ شاہ جیلانش
لطف حق چوں بردنظر کردم | از سر مہر دیدہ تر کردم

(ترجمہ: حضرت سلطان العارفینؒ نے فرمایا کہ اس بچے کو تم نے ہمارے حوالے کیا اور نذر کے طور پر ہمیں بخشا۔ ہم نے اس کے روحانی کمالات دیکھے اور ہمارا دل خوش ہوگیا کہ ایسا مرید بھی ہمارے زمرے میں ہے لیکن اس بچے کو پورے اعزاز کے ساتھ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے لئے پسند فرمایا اور اس کی دستگیری کی، یہی وجہ ہے کہ میری آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ یہ بچہ تو ایک ناپید کنار سمندر ہے۔ روحانی میدان میں شیر اور معرفت کی فضاء کا شہباز ہے۔ تمہاری یہ نیاز خاندانِ رسالت میں مقبول ہوگئی۔)

حضرت سلطان العارفینؒ نے اس بچے کو سنِ شعور تک پہنچنے کے بعد اپنے خلیفہ خاص حضرت بابا داؤد خاکیؒ کے حوالے کیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ عبوری طور پر اس کی تربیت کریں کیونکہ ان کا اصلی مرشد حضرت غوثِ پاکؒ کی ہدایت پر باہر سے آئے گا اور یہ سب اپنے وقت پر ہوگا۔

حضرت بابا داؤد خاکیؒ، حضرت میرؒ کی تربیت کرتے رہے اور کچھ عرصے کے بعد کشمیر میں جناب حضرت میر اسماعیل شامیؒ کا ورودِ مسعود ہوا۔ وہ حضرت بابا داؤد خاکی کے ہاں فروکش ہوئے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ حضرت میر اسماعیل شامیؒ مامور تھے کہ وہ کشمیر میں سلسلۂ عالیہ قادریہ کو ترویج دیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت بابا داؤد خاکیؒ سے ایک جوانِ صالح کی طلب کی، جسے وہ تربیت دے سکیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت بابا داؤد خاکیؒ نے اپنے فرزند پیش کئے، مگر حضرت شامیؒ نے فرمایا کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں۔ آخر الامر حضرت خاکیؒ نے میر نازک نیازیؒ کو پیش کیا جو فوراً منظور ہوئے۔ مولانا بہاؤالدین متو فرماتے ہیں۔

خواست سیدؒ ز شیخؒ فرزندے — کہ ہرد تربیت کند چندے
شیخ فرزند ہائے کودک خویش — برد ہریک جدا جدا درپیش
گفت اینہا چودک اندبسے — نیست آوان تربیت بے
طالب گرمرید تو باشد — مستفید درشید تو باشد
حکم فرما پیش من آید — سرزگنج نہفتہ بکشاید
شیخ فرمود میر نازکؒ را — کہ توئی لایق ایں نیزک را

اِن اشعار کا مفہوم وہی ہے جو اُوپر کی سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح حضرت میر نازکؒ قادری سلسلے میں حضرت میر اسماعیل شامیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور مجاز بنے اور کشمیر میں قادری سلسلے کے بانی ہوئے۔ چنانچہ مولانا

بہاؤالدین متو فرماتے ہیں کہ میر اسماعیل شامیؒ نے حضرت میرؒ سے کہا کہ یہ دولت جو تجھے حاصل ہوئی ہے، حضرت غوث الاعظمؒ کے ارشاد سے ہوئی ہے اور پھر

مہرازیں لطف وزیں کرامت ہا — از خدا خواست استقامت ہا

طالبان را بخود صلادر داد — بخدا راہ از صفا در داد

فرقہ در برز مہر رافت کرد — جاسر مسند خلافت کرد

محاوری نقش زد بروئے نگین — میر نازکؒ غلام محی الدینؒ

(ترجمہ: ان عنایتوں اور کرامتوں سے انہوں نے خدا سے راہِ حق پر چلنے کیلئے استقامت کی۔ دعا کی جو قبول ہوئی اور طالبانِ حق جوق در جوق ان کے چشمۂ مغفرت سے سیراب ہونے لگے۔ آپ کی انگوٹھی میں جو نگینہ تھا اس پر میر نازک غلام محی الدین کندہ تھا۔)

میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ کشمیر میں زاہدانِ مرتاض، عابدان شب زندہ دار اور مقربان بارگاہ کی کمی نہیں۔ مگر تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں جناب میرؒ بے نظیر ہیں۔ آپ کا مزارِ پُرانوار اور آپ کی خانقاہ محلّہ کادی کدل میں آج بھی مرجعِ خلایق ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان دنوں نالہ مار پر ایک پُل تعمیر ہو رہا تھا جس کا نام کادی کدل ہے۔ حضرت میرؒ اس تعمیر کو اکثر دیکھتے۔ ایک روز دیکھا کہ ایک عورت زاروقطار رو رہی ہے۔ سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پُل بنانے والے ٹھیکیدار نے اس کے کچھ پتھر اٹھا لئے ہیں اور اُنہیں پُل کی تعمیر میں لگا رہا ہے۔ ٹھیکیدار بارسوخ آدمی تھا۔ اس نے

عورت کی ایک نہ سنی اور حضرت میرؒ نے فیصلہ کیا کہ اس پُل کو عبور و مرور کیلئے کبھی استعمال نہیں کریں گے، کہ اس پُل پر غصب شدہ مال لگایا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب نہ وہ نالہ مار ہے جس کا وجود ایک زمانے میں شہر کے حُسن کو دوبالا کرتا تھا اور نہ وہ کادی کدل جس کو زمین دوز کر کے ایشیاء کے اس وینس کو برباد کر کے رکھ دیا گیا ہے اور وہ دِن بھی دور نہیں جب ڈل کا وجود ختم ہو جائے گا۔ جنگلات کا صفایا ہوگا اور یہ جنتِ اراضی ایک ریگستان میں بدل جائے گی۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

حضرت میر نازک قادریؒ کے تقویٰ کی مورّخوں نے کئی مثالیں دی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضرتؒ اس وقت تک کوئی بھی تحفہ قبول نہیں فرمانے جب تک اس کی ملت و حرمت اور اس کے ماخز کے بارے میں دریافت نہ کرتے۔ تحفہ لانے والے سے پوچھتے تمہارا کوئی شریک تو نہیں؟ اگر ہے تو کیا اس کی اجازت حاصل ہے۔ کیا اس پر سرکاری ٹیکس ادا کیا گیا ہے؟ اگر ذرّا بھی شبہ ہوتا تو تحفہ لینے سے انکار فرماتے۔ غلام محی الدین سرائے بلی اپنی کتاب تحایف الابرار میں فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حکامِ وقت میں سے ایک صاحب میرؒ سے ملنے آئے۔ آپ نے اسے اس وقت تک اندر آنے کی اجازت نہ دی جب تک خانقاہ کے سارے بورے اُٹھوانہ لئے۔ اندر آکر حاکمِ وقت نے کچھ روپیہ بطورِ نذر پیش کیا۔ آپؒ نے حاکم کی موجودگی ہی میں وہ ساری رقم غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر ڈالی۔ حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ سلسلہ قادریہ کے ایک بلند مرتبت

بزرگ ہیں، وہ کچھ عرصے کے لئے کشمیر آئے اور چھتہ بل میں مقیم رہے۔ یہاں بہت سے لوگوں نے ان کو مدعو کیا اور آپؒ نے بلا تحقیق وہ دعوتیں قبول کیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو اپنے کمال میں زوال کے آثار نظر آنے لگے، بہت گھبرائے اور لوگوں سے استفسار کیا کہ کیا اس شہر میں قادری سلسلے کے کوئی بزرگ ہیں؟ لوگوں نے حضرت میر نازکؒ نیازی کا نام بتادیا اور آپ نے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضرت میرؒ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے مٹھی بھر چاول اپنی اہلیہ کو دیا اور کہا کہ ایک مہمان آرہے ہیں۔۔۔۔ حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ تین روز تک حضرت میر نازک قادریؒ کے مہمان رہے اور حضرت شاہ نعمت اللہ قادریؒ نے دیکھا کہ وہ نہ صرف اپنا کھویا ہوا کمال حاصل کر سکے بلکہ ان کے روحانی مدارج میں ہر روز ترقی ہوتی گئی۔ دل میں خیال آیا کہ اب یہیں پڑا رہوں گا۔ حضرت میرؒ نے چوتھے روز صبح مٹھی بھر چاول ان کے سپرد کئے اور فرمایا کہ مہمان کو تین دن تک ٹھہرانا سنت نبویؐ ہے۔ یہاں پڑے رہنے کے خیال سے باز آؤ کیوں کہ۔

وُگرائے میر نازکؒ جو خون جگر است

بہر کے مفت میسر نتواند شد

یعنی میر نازک جو کا 'وُگرا' جگر کا خون ہے اور ہر کسی کو آسانی سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ساتھ ہی انہیں کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ اب جائیے اور پھر دوبارہ نہ آیئے۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ

نعمت اللہ قادریؒ پھر حاضر ہونے کیلئے بے قرار ہوئے اور انہوں نے کہلا بھیجا۔

مادر فراقِ تو سوختیم

یعنی ہم آپ کے فراق میں جل رہے ہیں۔ حضرت امیرؒ نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھا۔

ماسوختیم، خاکستر شدیم و برباد در فیتم

یعنی ہم تو پہلے ہی جل کر خاکستر ہوگئے ہیں اور یہ راکھ اُڑ کر برباد ہوگئی ہے۔ اب کس سے ملنا چاہتے ہو؟

مولانا بہاؤ الدین متو نے بابا داؤد مشکواتیؒ کی کتاب ''اسرارالابرار'' سے نقل کیا ہے کہ جامع مسجد سرینگر میں ایک عجیب الخلقت پرندہ مینار مسجد پر نمودار ہوا جو شکل وصورت اور قد وقامت کے لحاظ سے باز کے برابر تھا۔ اس کا سر اور پاؤں سفید تھے اور وہ مسجد کے چاروں میناروں پر طواف کرتا رہا۔ لوگ اسے پتھر مارتے مگر نہ وہ اس سے متاثر ہوتا اور نہ خوف زدہ۔ دو ہفتے تک یہی عالم رہا۔ لوگ یہ ماجرا لے کر حضرت میر نازک قادریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے تھوڑے سے غور وفکر کے بعد کہا، جاؤ اس سے کہو، ''ہم نے تمہارا پیغام سنا۔'' جوں ہی اس پرندے نے یہ پیغام سنا، وہ اڑ گیا اور چند روز کے بعد حضرت میر نازک قادریؒ کا انتقال ہوا۔

آپؒ کے انتقال کے کئی سال بعد یہی پرندہ پھر نمودار ہوا اور اس سال کشمیر میں وبائے ہیضہ سے بے شمار لوگ ہلاک ہوگئے۔ پھر کئی سال بعد پھر نمودار

ہوا تو کشمیر قحط کی لپیٹ میں آ گیا اور ہزاروں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ یہ واقعہ تحفتہ الابرار، تاریخ اعظمی اور تاریخ کی دیگر کتابوں میں درج ہے۔

حضرت مولانا بہاؤ الدین متوؒ نے اپنی کتاب 'سلطانی' میں حضرت میر نازک قادریؒ کے کمالات کا تذکرہ یوں فرمایا ہے۔

قدوہ برگزیدان آلہ — زبدہ محرمان درگہ شاہ
شاہباز تراوق ملکوت — خازن گنج خانہ لاہوت
مسند آرائے ملک درویشی — راہ پیمائے فقر دل ریشی
از ازل اونہادہ در تفرید — تا ابد مست بادۂ توحید
نکشادہ بغیر سنت دم — برسول خداؐ قدم بقدم
میر نازکؒ بحر معنیٰ بود — بلکہ زاں بحر دریکتا بود
جداو بہ اوسر بحر بخارا زد — سرچو خورشید آشکارا زد

(ترجمہ: اللہ کے چنے لوگوں کا پیشوا، اللہ تعالیٰ کے رازوں کے محرّم بزرگوں کا خلاصہ، ملکوت کے پردوں میں اڑنے والے شاہباز اور لاہوت کے خزانے کا خزانچی، درویشی کے مُلک کا مسند نشین اور فقردل ریشی کی منزلیں طے کرنے والا۔ ازل سے ابدتک تفرید اور توحید کیلئے متوالا۔۔۔۔ وہ بزرگوار جس کی ہر سانس نستِ رسولؐ کے مطابق تھی اور جو قدم قدم حضور رسالتمآبؐ کا تابع تھا۔ اس کا نامِ نامی میر نازک ہے جو معنویت کا سمندر تھا۔ بلکہ معنویت کے سمندر میں لاثانی اور بیش بہا موتی تھا۔ ان کے جدِ پاک (میر علی محمد بخاری)

بخارا سے آئے اور یہاں آفتابِ عالم تاب بن کر چمکے۔)

کتاب ''تحفتہ الابرار'' میں لکھا ہے:

''شایق و مورخان دیگر مثل شیخ داؤد خاکی رحمتہ اللہ علیہ و صاحب خوارق السالکین و بہاؤ الدین متو، درکتابِ غوثیہ سیادت حضرت سیو سیادت بنی اعمام ایشان مے نگارند۔''

یعنی شایق اور دوسرے مورخ مثلا بابا داؤد خاکیؒ صاحب خوارق السالکین اور بہاؤ الدین متو اپنی کتاب میں حضرت میر اور ان کے بنی اعمام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ سیّد تھے۔ اسی کتاب میں حضرت میر سید یعقوب کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

''از سادات عالی درجات صاحب حالات و مقامات سودہ۔ چنانچہ صاحب خوارق السالکین در ذکر ایشاں می نگارد کہ قدوۂ آفاق زبدہ عشاق مرشد و محبوب حضرت سید یعقوب موزادہ میر نازکؒ نیازی قادری از ارادتمندان شیخ داؤد خاکی بود۔''

ان میر سید یعقوب کا مزارِ پُر انوار سونہ وار میں مرجع خاص و عام ہے۔

حضرت میر نازک قادریؒ ۹ رذی الحجہ ۱۰۲۲ھ کو اس دارِ فانی سے دارالبقاء کی طرف روانہ ہوئے۔ تقیاً تقیاً سے سالِ وصال حاصل ہوجاتا ہے۔ آپ کا مزارِ پُر انوار اور آپ کی خانقاہ کادی کدل میں مرجعِ عوام ہے۔ عمرِ شریف کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی کیونکہ تاریخِ ولادت معلوم نہیں۔ مگر آپ چوں کہ خود

حضرت سلطان العارفینؒ کے زیر تربیت رہے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد حضرت بابا داؤد خاکیؒ ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ حضرت بابا داؤد خاکیؒ کا وصل ۹۹۴ھ میں ہوا، اس وقت وہ حضرت اسماعیل شامیؒ کے حوالے ہو گئے تھے اور قیاس کہتا ہے کہ ان کی عمر اس وقت ۲۵،۳۰ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس طرح اندازاً پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔

ان سطور کا لکھنے والا حضرت میر نازک قادریؒ کی گیارہویں پشت میں ہے۔ اور ''بدنام کنندہ نکونا مے چند'' بنا ہوا ہے۔

☆☆☆

غبارِ کارواں

شہنشاہ اکبر جلال الدین سے پہلے پہلے کشمیر کے سلطان زین العابدین کے دربار میں نَورتن تھے، ان میں سے ایک میر علی محمد بخاری تھے، جو سلطان کی درخواست پر ترکِ وطن کر کے بخارا سے کشمیر آئے اور یہاں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ میر علی بخاری کا خاندان اپنی نجابت و شرافت اور علمی فضیلت کی بناء پر کشمیر میں ہمیشہ مرجع خلائق رہا اور ان کی اولادِ صالح نے اپنا آبائی پیشہ بدستور اپنائے رکھا۔ ان میں سے قاضی محمد موسیٰ شہید اور میر نازک قادریؒ نے علم و فضل کے علاوہ عالمِ روحانی میں بھی نام پایا اور تاریخِ کشمیر کے اوراق اِن کے ذکر سے منوّر ہیں۔ میر نازک قادریؒ کی وفات ۱۰۲۲ہجری میں ہوئی۔ وہ کشمیر میں سلسلۂ قادریہ کے بانی تھے۔ حضرت اسماعیل شامیؒ غیبی ارشاد پا کر کشمیر آئے تھے اور حضرت میر نازک قادریؒ کو سلسلۂ قادریہ میں بیعت فرما گئے

تھے۔ یہی میر نازک قادریؒ اس نامہ سیاہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں اور انہی کی نسبت سے ہمارا خاندان نازکی کہلاتا ہے۔ حضرت میر نازک قادری کا مزارِ پُر انوار سری نگر کے محلّہ کادی کدل میں آج بھی ہزاروں تشنگانِ فیض کو سیراب کرتا ہے اور صبح و شام لاتعداد زائرین کا ہجوم اس خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کرتا رہتا ہے۔ میری ولادت اِسی محلے میں ۳/ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ یوم چہار شنبہ، مطابق ۱۶/ مارچ ۱۹۱۰ء بوقتِ صبح صادق ہوئی تھی۔ میری ولادت کے دو برس بعد میرے والدِ بزرگوار میر غلام مصطفیٰ نازکی نے سرینگر سے ہجرت فرمائی اور سرینگر سے ۳۴ میل دور بانڈی پور کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں میں سکونت اختیار فرمائی۔ بانڈی پور کا علاقہ بڑا مردم خیز ہے۔ یہ قصبہ ایشیا کی سب سے بڑی جھیل ولر کے کنارے آباد ہے اور سیاحوں کی کشش کا مرکز ہے۔ اس علاقے نے بڑے اصحابِ علم و فضل پیدا کئے ہیں جن میں حسن شاہ مورّخِ کشمیر اور ان کے بھانجے عبدالاحد نادمؔ، کشمیر کی تاریخ میں رہتی دُنیا تک یاد رہیں گے۔ عبدالاحد نادمؔ نے کشمیری زبان میں نعتیں لکھی ہیں، جو ہر گھر میں پڑھی جاتی ہیں اور انہیں بجا طور پر حسانِ کشمیر کا لقب دیا گیا ہے۔ میرے والدِ بزرگوار فارسی اور عربی کے بڑے جیّد عالم تھے، نماز، روزہ اور تہجد کے عمر بھر پابند رہے۔ گھر میں سوائے دولتِ علم اور کوئی چیز نہ تھی۔ اکثر اوقات فقر و فاقہ رہتا تھا۔ مگر توکل کا یہ عالم تھا کہ کسی کے سامنے اپنی حاجت بیان نہ کرتے۔ ساری عمر تبلیغِ دین اور درسِ قرآن و حدیث میں مصروف رہے۔ بانڈی پور جا کر ان کی صحبتیں عبدالاحد نادمؔ سے رہیں اور یہ

دونوں یارِ غار بنے۔ میں نے جب آنکھ کھولی، تو اپنے گرد کتابوں کے انبار کے سِوا اور کچھ نہ تھا۔ رات دن علمی چرچا رہتا اور جب ذرا شعور بالغ ہوا تو والد مرحوم ومغفور نے بڑی دل سوزی اور توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ ابتداء میں حسب رواج کلام اللہ پڑھایا، ان کے ارادہ مجھے کلام اللہ حفظ کرانے کا تھا، مگر ابتدائے عمر میں میری صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے یہ ارادہ چھوڑ دیا مگر قرآنِ حکیم کی ناظرہ تلاوت اس سختی سے کرائی کہ آج تک اس سے لذّت یاب ہوں اور ہر روز ایک دوپارے پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔ قرآنِ کریم کے بعد صرف ونحو، عربی کے ابتدائی رسائل اور فارسی کی ابتدائی کتابیں شروع کیں۔ اللہ کے فضل سے ذہین تھا اور جو بات ایک دفعہ کان میں پڑجاتی تھی، وہ نقش ہوکر رہ جاتی۔ بارہ برس کی عمر میں قرآنِ حکیم کا ترجمہ صرف ونحو کی بہت سی کتابیں اور فارسی میں پنج گنج نظامی کی تحصیل سے فارغ ہوچکا تھا اور اَب والدِ بزرگوار نے مجھے اوروں کو پڑھانے پر مامور فرمایا تھا۔ ان کا ارادہ مجھے مرّوجہ تعلیم دلانے کا ہرگز نہ تھا۔ اتفاق سے اس زمانے میں سری نگر کے محلّہ نوشہرہ کے ایک استاد غلام محی الدین صاحب بانڈی پور کے سکول میں تبدیل ہوکر آئے۔ یہ صاحب عقیدتاً احمدی تھے اور اربابِ علم کی تلاش میں رہتے تھے تاکہ مناظرہ کرسکیں۔ بانڈی پور میں میرے والد بزرگوار علماء کے سرتاج تھے۔ ان کے پاس بھی آنے جانے لگے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ ان سے کوئی مناظرہ ہوا یا نہیں۔ مگر انہوں نے مجھے اس چھوٹی سی عمر میں فارسی کا فارغ التحصیل دیکھا تو حیران ہوئے اور میرے والد بزرگوار سے کہا کہ

آپ اتنے ذہین بچے کو مروجہ تعلیم نہ دلا کر بڑا ظلم کر رہے ہیں۔ کئی ماہ کے ردوقدح کے بعد میرے والد مجھے سکول بھیجنے پر آمادہ ہوئے اور میں پہلی دفعہ سکول گیا تو مجھے چوتھی جماعت میں داخل کر دیا گیا۔ اردو زبان کے ساتھ اس سے پہلے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بانڈی پور میں اس زمانے میں لوئر مڈل سکول تھا۔ میں نے چھٹی جماعت کا امتحان پاس کیا تو تعلیم کو جاری رکھنے کا مسئلہ درپیش آیا۔ آخر کار میں سرینگر آیا اور اپنے قدیم آبائی محلے کادی کدل میں اپنے بنی اعمام کے ہاں فروکش ہوا۔ نصرۃ الاسلام ہائی سکول میں داخل ہوا اور ۱۹۲۶ء میں مڈل اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی کے امتحانات بیک وقت پاس کیے۔ گھر میں سخت افلاس تھا۔ تعلیم کو جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے تلاشِ معاش کی فکر ہوئی تاکہ والد صاحب کا بوجھ ہلکا ہوجائے۔ بانڈی پور جاکر بیٹھا رہا۔ ایک روز بیٹھے بٹھائے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس کے نام نوکری کیلئے درخواست بھیج دی۔ ان کا دفتر سوپور میں تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا۔ مڈل اور منشی کے سٹرفکیٹ دیکھے تو کچھ حیران سے ہوئے۔ بولے۔ اتنی چھوٹی عمر میں تم نے منشی کا امتحان پاس کیا ہے۔ مگر کسی سکول میں جاکر کیا کرو گے۔ بہر صورت انہوں نے مجھے اپنے گھر سے چالیس میل دور آٹھ روپے مہینے پر استاد مقرر کر کے بھیج دیا۔ یہ چالیس میل مجھے پیدل طے کرنا تھا۔ اور دوروز میں میں منزل مقصود پر پہنچا۔ یہ ایک پرائمری سکول تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ جو میرے چارج میں تھی۔ سکول میں کافی کام رہتا تھا۔ میں نے لائبریری کی کتابیں ایک ایک کر کے نکالیں اور گھر میں

انہیں پڑھتا رہا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہ کتابیں اس گاؤں کے سکول کی لائبریری میں کس نے رکھی تھیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی میں جو نیا موڑ آیا وہ اسی لائبریری نے دیا۔ اس لائبریری میں مولوی نذیر احمد کی کتابیں توبتہ النصوح، ابن الوقت، فسانۂ مبتلا، رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد، مولوی محمد حسین کی آبِ حیات وغیرہ اعلیٰ پائے کی کتابیں تھیں اور ان کتابوں نے مجھ پر اپنی گرفت اتنی مضبوط کر دی کہ میں نے انہیں کئی کئی مرتبہ پڑھ ڈالا اور طبیعت پھر بھی سیر نہ ہوئی۔ مجھے اب یاد ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کی آبِ حیات میرا روز کا وظیفہ بن گئی اور میں کم وبیش اس کا حافظ بنا اور اسی کتاب نے میرے اندر اردو ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اور اسی زمانے میں میں نے اُردو میں شاعری شروع کی۔ ابتداء میں غزلیں لکھتا رہا اور اس دور کی تمام غزلوں کو میں نے ضائع کر دیا ہے اور اب مجھے ان میں سے کوئی غزل یا کسی غزل کا کوئی شعر بھی یاد نہیں۔ کچھ عرصے کے بعد میں بانڈی پور کے لوئر مڈل اسکول میں تبدیل ہوکر آیا اور یہاں میں نے اپنے والد بزرگوار کو اردو کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کی طبیعت اردو کی طرف راغب نہ ہوسکی۔ بانڈی پور سکول کی لائبریری میں مجھے پہلی دفعہ اقبال کی بانگِ درا پڑھنے کو ملی اور اس نے مجھے تمام کتابوں سے برگشتہ خاطر کر دیا۔ رات دن اس کا مطالعہ جاری رہا تو ایک روز والد بزرگوار نے مجھ سے پوچھا یہ کونسی کتاب ہے۔ میں نے حاضر کر دی اور وہ اسے پڑھنے لگے اور دس بارہ روز تک صرف اسی کے مطالعے میں مشغول رہے۔ اسی کتاب نے اُنہیں بھی میری طرح اقبال کا

پرستار بنادیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اور میں نے اقبال کا فارسی کلام بھی پڑھا۔ اور ہماری نظریں کھل گئیں۔ اقبال کا ایک شعر تو والدِ مرحوم کو اتنا عزیز تھا کہ موت سے پہلے اکثر اسے پڑھتے رہتے تھے۔

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
وگرکشادہ جبینم گل بہارِ توام

اس دوران میں نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں اور پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی عالم، منشی فاضل، ادیب عالم اور ادیب فاضل، میٹرک اور ایف اے کے امتحانات پاس کیئے۔ بی اے کا امتحان میں نے کشمیر یونیورسٹی سے حصول آزادی کے بعد پاس کیا۔ محکمہ تعلیم میں کوئی قدر افزائی نہ ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں خواجہ غلام السیدین ناظم تعلیمات بن کر آئے، تو استادوں کی ذرا قدر ہونے لگی۔ میں اس زمانے میں سری نگر کے ایک سکول میں استاد تھا۔ مجھے انکی بچیوں کو پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے مجھے اپنا لیٹریری اسسٹنٹ بنادیا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے ایک رسالہ تعلیم جدید کے نام سے نکلتا تھا۔ میں اس کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ اس کے بعد میں ٹیچرز ٹریننگ سکول میں استادِ زبان کے عہدے پر فائز ہوا۔ پھر اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر بنا۔ ۱۹۴۷ء میں کشمیر پر قبائلی حملہ ہوا اور سارا نظام کچھ دیر کے لئے درہم برہم ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں زمام اختیار جانب شیخ محمد عبداللہ کے ہاتھ میں آگئی اور انہوں نے مجھے محکمہ تعلیم سے نکال کر پہلے جموں اور پھر سرینگر کے ریڈیو سٹیشن میں پروگرام اسسٹنٹ مقرر کیا۔ سرینگر

ریڈیو سٹیشن کا افتتاح یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو ہوا اور اس کا پہلا اعلان میں نے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں سرینگر ریڈیو آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ مدغم ہوا اور ۱۹۶۴ء میں تقریباً چالیس سال کی ملازمت کے بعد میں ریٹائر ہوا۔ ریڈیو کشمیر میں انتھک محنت کے باوجود میں کوئی قابلِ قدر ترقی نہ کر سکا اس لئے کہ میں بخشی غلام محمد صاحب کو خوش نہ کر سکا۔ ریٹائر ہونے کے بعد خواجہ غلام محمد صادق مرحوم نے ایک کشمیری ہفتہ وار ''چمن'' کی ادارت میرے سپرد کی جو اب تک جاری ہے۔

۱۹۳۸ء کا سال کشمیر میں بڑا صبر آزما وقت تھا۔ اِسی سال مسلم کانفرنس کو توڑ کر اسے نیشنل کانفرنس بنا دیا گیا۔ اس کا آفیشل آرگن ہمدرد تھا اور میں اسکا معاوِن خصوصی تھا۔ میری قومی نظمیں اس میں قلمی ناموں سے چھپتی تھیں۔ پنڈت کشپ بندھو کے اخبا دیش میں بھی میں 'غنی' کے نام سے انقلابی نظمیں لکھتا تھا۔ خالد ایک اور پرچہ تھا جس کی ادارت در پردہ میرے ذمے تھی۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے اخبار خدمت سنبھالا تو اس کی ترتیب کا سارا کام مجھ پر چھوڑ دیا اور یہ سارا کام میں اس لئے در پردہ کررہا تھا کہ گلے میں ملازمت کا طوق تھا۔ اس زمانے میں کشمیر میں موسم گرما میں ہندوستان کے ہر حصے سے شعراء کرام آتے اور کشمیر میں ہر روز کوئی نہ کوئی نشست یا مشاعرہ ضرور ہوتا۔ میں ان مشاعروں میں شرکت کرنے سے گھبراتا تھا۔ آخر ایک روز سید مبارک شاہ صاحب فطرتؔ گیلانی کے دولت خانے پر ایک نشست ہوئی جس میں احسان دانش، روش صدیقی، حفیظ جالندھری کے علاوہ بے شمار شعراء موجود تھے۔ مجھے بھی مجبور کر دیا گیا کہ کچھ

پڑھوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے غزل پڑھی۔ مطلع تھا۔

جہاں جاتا ہوں پہلے حال کہتا ہوں ان حسینوں کا
اَدب کرتا ہوں اِن کا شانۂ دل کے مکینوں کا

یہ مطلع سن کر سارا مجمع پھڑک اٹھا اور ہر طرف سے مجھ پر داد و تحسین کے پھول برسنے لگے۔ محفل میں حضرت مولانا محمد سعید مسعودی بھی تھے، جو مجھے جانتے تھے مگر میری شاعرانہ صلاحیتوں کا علم انہیں ابھی نہ تھا۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور اس کے بعد میری جھجک دور ہوئی اور میں اعتماد کے ساتھ مشاعروں میں پڑھنے لگا، مقامی اخبارات میں میرے کلام کی مانگ ہوئی۔ اب میں یہ تمنا کرنے لگا کہ میرا کلام ریاست سے باہر کے رسائل میں چھپ جائے۔ اس سلسلے میں میں نے ادبِ لطیف، لاہور اور ادبی دُنیا کے ساتھ خط و کتابت کی، مگر کافی عرصے تک انہوں نے میرے کلام کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ایک روز میں نے تنگ آکر اپنی ایک نظم جوشؔ ملیح آبادی کو بھیج دی۔ انہوں نے یہ نظم بلاترمیم اپنے رسالہ کلیم میں نمایاں طور پر چھاپ دی اور اس کے بعد کلیم سے یہ نظم ادبِ لطیف لاہور اور ادبی دُنیا نے بھی نقل کر دی۔ حالانکہ وہ اس سے پہلے اس نظم کو رد کر چکے تھے۔ اب میرا کلام ادب لطیف، ادبی دُنیا کے علاوہ ہمایوں میں بھی چھپنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ میری سب سے پہلی غزل میاں بشیر احمد نے ہمایوں میں ایک نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔ اس غزل کے دو شعر یہ ہیں:

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
کشمیر کی شادابی، شیراز کی رعنائی
ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا
اسے ذوقِ جبیں سائی، اے لذّتِ رسوائی

اب میں نے ادبی دُنیا میں اپنے لئے جگہ بنائی تھی۔ ملک کی آزادی کے بعد علم و ادب کے افق اور روشن ہونے لگے۔ کشمیر کے علاوہ جموں، دلی، جودھپور، جے پور، اندور، ناگپور، بٹالہ، جالندھر، لکھنو وغیرہ شہروں میں مشاعرے ہوئے اور میں نے ان میں شرکت کی۔ میرے اردو کلام کا مجموعہ دیدۂ تر کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کا کلام ابھی منتشر حالت میں ہے اور غیر مطبوعہ ہے۔

نثر کے سلسلے میں میرا خاص موضوع تصوّف اور کشمیر میں فارسی کا مقام رہا ہے۔ اس وقت تک کم و بیش دو سو مضامین ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ آج کل میں ان کے تسوید کر رہا ہوں اور انہیں کتابی صورت میں چھاپنے کا ارادہ ہے۔

نظمیں میں نے بہت کم لکھی ہیں۔ البتہ غزل، قطعات اور نعتیں اکثر لکھتا ہوں۔ ۱۹۵۳ء تک میں صرف اردو اور کبھی کبھی فارسی میں لکھتا رہا۔ اس کے بعد کشمیری میں بھی لکھنے لگا۔ کشمیری میں میں نے زیادہ تر قطعات لکھے ہیں اور ایک مجموعہ نمرودنامہ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کچھ غزلیں بھی لکھی ہیں۔ انشاء

اللہ انہیں بھی شائع کر دیا جائے گا۔

فارسی میں جو کچھ لکھا ہے بہت کم ہے۔ مگر یہ کہنا شاید خودستائی نہ ہوگا کہ اس کا معیار بہت اونچا ہے۔ ماسکو میں مشاعرہ کے نام سے فارسی نمائندہ ادب کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں میری ایک فارسی غزل شامل کردی گئی ہے۔ وہ غزل یہ ہے،

از تو قائم گرمے ہنگامہ بود و نبود — خیز وکم کن شکوہ ہائے گردش چرخ کبود
روزگارے درخم ابروے دلبر باختم — زاں سبب پیش خداوندے نیاوردم سجود
مرغکے دیشب بگلزارے بشاخ می سرود — شاہد گل راثباتے نیست دل دادن چہ سود
ہرکہ راحسنے عکا کردند او قاتش کم است — بلبل ازگل، گل زشبنم، شبنم از انجم شنود
جنتِ کشمیر رانازم کہ حسن ایں دیار — عشوہ کرد و دل ایرانیاں باخود ربود

بیوی اور اولاد کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خوش نصیب واقع ہوا ہوں۔ عائشہ گزشتہ اڑتالیس سال سے میری شریک سفر ہے۔ اس نے میرے ساتھ رہ کر شیرینیاں کم اور تلخیاں زیادہ برداشت کی ہیں اور کبھی اس کے ماتھے پر شکن نہیں آئی ہے۔ وہ فطرتاً فیاض واقع ہوئی ہے اور اس کی فیاضی نے مجھے ہمیشہ تنگدست رکھا ہے۔ درجنوں نادار، یتیم اور مفلس بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام اس نے کیا جو آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابند ہے اور سفرِ حج میں بھی میرے ساتھ تھی۔ آج بھی جب اس کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز ہے، صبح چار بجے اٹھتی اور رات کے بارہ بجے تک مصروف رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے وجود کو میرے اور بچوں کے وجود میں گم کر دیا

ہے۔ میری ایک بیٹی اور سات بیٹے ہیں۔ بیٹی ایک خوشحال سادات کے گھرانے میں ہے۔ بچے سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کچھ ان میں سے اچھے اچھے منصبوں پر فائز ہیں اور کچھ ابھی زیرِ تعلیم ہیں۔ الحمداللہ دین سے بدظن نہیں ہیں۔ اگر چہ بے عمل ہیں جس کا مجھے رنج ہے۔

میری زندگی جیسی بھی ہے وہ سب سے پہلے اپنے والد بزرگوار سے متاثر ہوئی ہے۔ ان کے بعد اقبالؔ، سعدیؔ، رومیؔ، ابن یمینؔ، غالبؔ، میرؔ اور میر درد نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ عہدِ حاضر کے لکھنے والوں میں سے مولانا عبدالماجد دریابادی سے بہت متاثر ہوں اور انہی کی وساطت سے حکیمِ امت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے افکار سے روشناس ہوا اور تمنا ہے کہ حشر کے دن ان کا دامن تھام سکوں۔ بہت گئی تھوڑی رہی، اپنے اعمال کو دیکھتا ہوں، تو حیران ہوجاتا ہوں کہ مجھ پر عنایات کا یہ دروازہ کیسے کھلا۔ داغ کا یہ شعر کتنا خوبصورت ہے۔

کیا کہوں میں کہ کیا کیا میں نے　　　کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے

جہالت کے زمانے میں لغزشیں بھی ہوتی ہیں اور شاید کوئی بشر ان سے خالی نہیں۔ ان کی یاد اس پیرانہ سالی میں بھی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ عہدِ گزشتہ کی ہر یاد حسین ہوتی ہے۔

باوجود اِدعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

☆☆☆

نعتیہ ادب

(ا)

نعت اس مدحیہ ادب کا نام ہے جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص ہے۔ نعتیہ ادب میں حضور کی تعریف و تمجید کے علاوہ التجاؤں اور آرزوؤں کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔ نعت دنیا کی ان تمام زبانوں میں موجود ہے، جہاں مسلمان آباد ہیں، اس کی ابتداء خود قرآن مجید سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اکثر مقامات پر قرآن حکیم میں بصراحت رسول کریم صلعم کی تعریف موجود ہے انّا أرسلناك شاهدا و مبشّرا و نذيرا و داعيا الى اللّه باذنه و سراجا منيرا' (الأحزاب) (بے شک ہم نے آپ کو شاہد، خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا، آپ اللہ کے حکم سے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والے ہیں، اور آپ ایک نورانی چراغ ہیں۔)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، 'وما أرسلناك الآ رحمة للعالمين' (الأنبياء) (بے شک ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔) 'وما أنت بنعمة ربّك بمجنون' (القلم) (آپ اللہ کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں)، 'وما علّمناه الشعر وما ينبغي له' (یٰس) (ہم نے رسول کریم صلعم کو شاعری نہیں سکھائی ہے، کیوں کہ شاعری ان کی شان کے شایاں نہیں۔) ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ 'لعمرك' کا لفظ استعمال فرماتے ہیں جس کے معنی ہیں مجھے آپ کی جان کی قسم ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعتیہ ادب کا سرچشمہ خود قرآن مجید ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ ثابت کرنا ہے کہ مختلف زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی توجہ نعت کی طرف اس لئے ہوئی کہ نعت کی ابتداء خود خدائے بزرگ وبرتر نے فرمائی ہے طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو قرآن حکیم سے سینکڑوں مثالیں پیش کی جاسکتی تھیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی شاعروں نے حضور کی تعریف وتوصیف میں شاعری کرنا شروع کی۔کعب بن زہیرؓ دور رسالت کا مایہ ناز شاعر تھا وہ دیر تک حضور کی مخالفت کرتا رہا اور اپنی آتش نوائی سے مختلف قبائلِ قریش کو حضور کے خلاف بھڑکاتا رہا آخر کار اس کا دل نور ایمان سے بھر گیا اور وہ ایک معذرت نامہ لے کر حضور کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا یہ معذرت نامہ "قصیدہ بانت سعاد" کے نام سے مشہور ہے، بعض لوگ اسے قصیدہ بردہ بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ حضور نے جب اس قصیدے کو سنا

تو بہت پسند فرمایا۔ اور اظہار پسندیدگی کے طور پر اپنی ردائے مبارک بھی کعب بن زہیرؓ کو عطا فرمائی۔ اس کا یہ شعر سارے قصیدے کے مرکزی خیال کو ظاہر کرتا ہے۔

أتيت عند رسول الله معزرة

والعزر عند رسول الله مقبول

(میں عذر خواہی کے لئے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، اور حضور معذرت کو قبول فرماتے ہیں۔)

قصیدہ بانت سعاد کا عربی ادب میں بڑا درجہ ہے کہ قصائد کی جو خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس میں بدرجہ اتم موجود ہیں، چنانچہ فلسفہ اور ادب کی بہت سی باریکیوں کو بھی اس قصیدے میں واضح کیا گیا ہے۔ انسان کے انجام یعنی موت کے بارے میں اس قصیدے میں ایک بہت ہی خوبصورت شعر ہے۔

کل ابن انثی و ان طالت سلامته

یوما علی آلة حدباء محمول

(ہر ماں کا بیٹا ایک روز ایک مستطیل صندوق میں کاندھوں پر اٹھا لیا جائے گا، چاہے وہ طویل ترین دور بھی زندہ رہ چکا ہو۔)

ہجرت کے موقع پر جب حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام مکّہ سے مدینہ تشریف لے گئے، تو مدینہ کی لڑکیاں فرطِ مسرت سے جھوم اٹھیں حضور کی تشریف آوری کی خوشی میں یہ استقبالیہ گیت گاتی تھیں،

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

(یعنی وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر بدر کامل طلوع ہوا)۔ ثنیات ثنیہ کی جمع ہے، ثنیہ عربی میں ٹیلے کو کہتے ہیں۔ ثنیۃ الوداع کا ٹیلہ قبا کے جنوب میں ہے، اور اہلِ مدینہ دوستوں کو یہاں تک چھوڑنے اور الوداع کہنے آیا کرتے تھے...... اسی لئے ان کا نام ثنیات الوداع پڑ گیا تھا۔)

ان معصوم لڑکیوں میں قبیلہ بنی نجار کی لڑکیاں خاص طور پر زیادہ سرگرم تھیں، کیوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی والدہ حضرت آمنہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا اپنا استقبالیہ گیت تھا،

'نحن بنات من بنی نحار'

(ہم قبیلہ بنی نجار کی لڑکیاں ہیں وغیرہ۔)

عربی ادب کا بڑا ذخیرہ نعتِ رسول پر مشتمل ہے، ایک بہت مقبول و معروف قصیدہ، قصیدۂ بردہ ہے، اس کے مصنف حضرت امام صالح شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن الحسن البوصیری ہیں۔ علامہ بوصیری طویل مدت تک فالج کے مرض میں مبتلا رہے جب سارے ذرائع ناکام ہوئے، اور علامہ اپنی زندگی اور صحت سے مایوس ہوئے، تو انھوں نے پورے خلوص سے یہ نعتیہ قصیدہ لکھا۔ اللہ کی شان جس روز علامہ اس کی تصنیف سے فارغ ہوئے اسی شب انھوں نے خواب میں حضرت رسول کریمؐ کو دیکھا۔ حضور نے قصیدہ سننے کی خواہش ظاہر فرمائی، اور علامہ بوصیری نے خواب ہی میں قصیدہ سنا ڈالا، قصیدہ پڑھتے وقت وہ کانپ رہے تھے،

حضور نے سبب دریافت فرمایا تو بولے سردی محسوس کرتا ہوں، حضورؐ نے اپنی ردائے مبارک عنایت کی، نیند سے جاگنے پر بوصیریؒ نہ صرف کلیتاً صحت یاب ہو چکے تھے بلکہ انھوں نے حضور کی عطا کردہ ردائے مبارک بھی موجود پائی۔ اسی اعتبار سے اس قصیدے کا نام قصیدۂ بردہ ہے اور بعض لوگ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، کعب بن زہیرؓ کے قصیدے کو بھی قصیدۂ بردہ کہتے ہیں۔

بوصیری کا قصیدۂ بردہ ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ محبت وعقیدت کے جذبات سے معمور ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

کالزھر فی ترف والبدر فی شرف
و البحر فی کرم والدھر فی ھمم

(حضور تروتازگی کے اعتبار سے شگوفہ کی مانند۔ یکتائی جمال میں بدرِکامل، جُودوسخا میں سمندر، اور علوہمت کے اعتبار سے زمانہ کی طرح ہیں۔)

اس قصیدے کے بعض اشعار میں ایک عجیب اور دلچسپ استدلال ہے، مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیا بیزاری کا جواز بوصیریؒ اس طرح دیتے ہیں۔

و کیف تدعو الی الدنیا ضرورۃ من
لولاہ لم تخرج الدنیا من العدم

(رسول کریم صلعم کو دنیا اپنی طرف کیونکر متوجہ کرسکتی؟ ارے دنیا تو وہ ہے جو اگر حضور نہ ہوتے تو کتم عدم سے کبھی باہر نہ نکلتی!)

اور پھر جہاں التجاؤں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ

التجائیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی ہیں۔ چند اشعار آپ بھی سنیے۔

'یا أکرم الخلق ما لی من ألوذ به

سواك عند حلول الحادثات العمم

یا نفس لا تقنطی من ذلة عظمت

ان الکبائر فی الغفران کاللمم

و لن یضیق رسول الله جاهك بی

اذ الکریم تحلی باسم منتقم

هو الحبیب الذی ترجی شفاعته

لکل قول من الأقوال مقتحم

(اے خلاصۂ آفرینش! میرے پاس کوئی اور نہیں آپ کے سواء جو میرا سہارا بن سکے اس وقت جب مجھ پر ہر طرف سے مصائب کی یورش ہو جائے، اے میرے نفس تو مایوس نہ ہو جا، کہ تیرے گناہوں کا کوئی شمار نہیں بڑے بڑے گناہ رسول رحمت کی رحمت کے سامنے تو کچھ بھی نہیں ہیں، اور یقین رکھ کہ جس وقت اللہ جل شانہ منتقم بن کر بندوں سے حساب لینے لگے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا دروازہ بدستور کھلا رہے گا۔ حضور وہ محبوب ہیں جن کی شفاعت کی امید ہر اس وقت رکھی جا سکتی ہے، جب اہوال و آلام کا ہجوم ہو جائے۔)

عربی زبان میں ایک اور نعتیہ ادب دلائل الخیرات کے نام سے مشہور

ہے، قرآن حکیم کا ارشاد ہے 'ان اللّٰہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یا أیھا الذ ین آمنوا صلّوا علیہ و سلّموا تسلیما'۔

(بے شک اللہ اور اس کے فرشتے رسول پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان و الوتم بھی رسول پر درود سلام بھیجتے رہو۔)

اس حکم کی رو سے درود ہر مسلمان پر فرض ہے، دلائل الخیرات اس حکم کی تعمیل کی طرف ایک بہت بڑا قدم ہے، درود وسلام کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی، جو اس کتاب میں بڑے خوبصورت اور حسین انداز میں پیش نہیں کی گئی ہے، اور کہیں کہیں تو حضور پُرنور کی نعت کا اسلوب اتنا پیارا ہو گیا ہے کہ انسان کا مذاق سلیم دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، یہ کتاب نثر کی ہے، مگر یہ نثر بہت سے لوگوں کی شاعری سے بدرجہا بہتر ہے۔ چند مثالیں ملاحظ فرمایئے

اللھمّ صل علی سید نا محمدالذی ھو قطب الجلالة و شمس النبوّة و الرسالة و الھادی من الضلالة و المنُقذ من الجھالة صلی اللّٰہ علیہ و سلّم صلوة دائمة الاتصال و التوالی متعاقبة بتعاقب الأیّام و اللیالی

خداوندا دُرود بھیج محمدؐ پر جو بزرگی اور جلالت کے مدار اعظم ہیں، جو نبوت کے آفتاب اور رسالت کے سورج ہیں، جو گمراہی سے نکال کر ہدایت بخشنے والے ہیں۔ جو جہالت سے نجات دلانے والے ہیں، ایسا دُرود جو علی التواتر اور پے در پے ہو، جو ایک دوسرے کے پیچھے اس طرح ہو جس طرح رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے، (اس بات کو ضرور نوٹ فرمایئے کہ ترجمے سے اصل

عبارت کا حسن ہمیشہ مجروح ہو جاتا ہے۔)

ایک اور جگہ ملاحظ فرمایئے۔

اللھمّ صل علی سید نا محمد النبی الأصیل السید النبیل الذی جاء بالوحی و التنزیل و أوضح بیان التأویل و جاء ہ الأمین جبرئیل بالکرامۃ و التفضیل و أسری بہ الملك الجلیل فی اللیل البھیم الطویل۔

(خداوندا دُرود بھیج محمدؐ پر جو ایک شریف پیغمبر ہیں، جو ایک بزرگ سردار ہیں جو وحی و قرآن کو ساتھ لے کر آئے ہیں، جنھوں نے قرآن حکیم کی تفسیر و تاویل صفائی سے بیان فرمائی، جن کے پاس جبریلِ امین عزت و حرمت کے ساتھ آئے، جن کو اللہ نے معراج کی رات میں جو بابرکت اور طویل تھی سیر کرائی اور اپنے دیدار سے مشرف فرمایا)

صاحب دِلائل ُالخیرات کا اسمِ گرامی ابُوعبداللہ محمد بن سلمان الجزولی رحمتہ اللہ علیہ ہے، وہ صحیح النسب سیدزادے ہیں، بہت بڑے عالم، محقّق، عارف اور ولی کامل گذرے ہیں آپ کا طریقہ شاذلیہ ہے، آپ کی تصانیف کا اکثر حصہ تصّوف کے موضوع پر ہے، آپ کے شاگردوں کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ ہے، آپ کے والد قبیلئہ جزولہ کے امراء میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ سوس لقصوب ملکِ بربر کے رہنے والے تھے، مراکش کے شہر فاس میں آپ نے علم حاصل کیا اور ایک عرصہ تک وہاں تفسیر وقرآن پڑھاتے رہے پھر ریف چلے آئے اور یہاں ان کی ملاقات شیخ محمد بن عبداللہ سے ہوئی، ان سے آپ نے علوم باطنی حاصل

کئے، چودہ برس تک خلوت نشین رہے، روایت ہے کہ بارہ ہزار چھ سو پینسٹھ آدمیوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور منکرات سے تائب ہوئے، کتاب اُللہ اور سنت رسول کے سختی سے پابند تھے، اور دِرُود آپ کی غذا تھی، اس کے بغیر آپ کا ایک لمحہ بھی نہ گذرتا تھا۔ دلائل اُلخیرات کو اللہ نے قبول عام بخشا ہے، اور آج تک حرمین شریفین میں اس کا ورد جاری ہے۔ایک دو مثالیں اوپر دے چکا ہوں بخوف طوالت صرف ایک اور مثال دوں گا جو ادبی اعتبار سے بہت بلند ہے۔

اللهمّ صل علی سیّد نا محمد النبی الأمی و علی محمد الذی هو أبهی شموس الهدی نورا و أبهرها و أسیر الأنبیاء فخرا و أشهرها و نوره أزهر أنوار الأنبیاء و أشرقهاو أوضحهاوأزکی الخلیقة أخلاقا و أطهرها و أکرمها خلقا و أعدلها

الٰہی رحمت نازل فرما ہمارے سردار حضرت محمد پر جو نبی امی ہیں اور ان کی اولاد پر جو ہدایت کے تمام آفتابوں سے زیادہ تابناک ہیں نور کے اعتبار سے اور ان سب پر غالب بھی ہیں، تمام پیغمبروں میں زیادہ فلک سیر اور زیادہ نامور ہیں، ان کا نور تمام انبیا کے نور سے زیادہ درخشاں ہے، ان کے اخلاق تمام مخلوق کے اخلاق سے اعلیٰ اور پاکیزہ تر، اور ان کا وجود تمام آفرینش سے بزرگ تر اور حسین تر ہے ...... عربی ادب میں نعتِ رسول کا ایک اور شاہکار حضرت سید نا شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ رضی اللہ عنہ کی مشہورِ آفاق تصنیف کبریتِ احمر ہے، جو اگرچہ حجم

میں زیادہ نہیں مگر معنویت کے اعتبار سے سب پر بھاری ہے۔

کبریت احمر بھی اگرچہ نثر میں ہے مگر اس کی دلکشی اور جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ دو چار مرتبہ اسے پڑھیئے، تو ایک اچھے شعر کی طرح ذہن پر مرتسم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ابتداء ہی دیکھئے کس آن بان سے ہوتی ہے ۔

اللهمّ اجعل أفضل صلوٰتك عددا و أنمى بركاتك وأزكى تحيّاتك

فضلا و مدارا على أشرف الحقائق الانسانية و معدن الدقائق الايمانيّة

وطورالتجليات الاحسانيّةو مهبط الأسرار الرحمانيّة

واسطة عقد النبيين مقدم جيش المرسلين و أفضل الخلائق أجمعين۔

(خدا وندا اپنی بہترین رحمت بھیج اور بار بار بھیج، اپنی لافانی برکتیں نچھاور کر، اپنے پاکیزہ تحائف فضیلت کے طور پر عنایت کر اس ذات گرامی کو، جو حقائق انسانیت کا خلاصہ ہے، جو ایمان کے نکات کی کان ہے، جو تجلیاتِ احسانی کے کوہِ طُور ہیں، جو اسرارِ الٰہی کے آماجگاہ ہیں، جو رسولوں کے ہار میں درمیانی جواہر ہیں، جو پیغمبروں کے سرلشکر ہیں، اور جو تمام مخلوق سے افضل و برتر ہیں۔)

اوصاف محمدی کا یہی سلسلہ ہے جو تابناک ہیروں کی ایک مالا کی طرح چمک رہا ہے فرماتے ہیں۔

المتخلّق بأعلى رتبة العبوديّة المتحقق بأسرار المقامات الاصطفائة

سيّد الأشراف و جامع الأوصاف الخليل الأعظم الحبيب الأكرم

المخصوص بأعلى المراتب و المقامات و المؤيّد بأوضح البراهين

والدلات

المنصور بالرعب والمعجزات الجوهر الشریف الأبدی و النور القدیم السرمدی سیّدنا محمد المحمود فی الایجاد و الوجود الفاتح لکل شاھد ومشھود

(وہ ذاتِ گرامی جو عبودیت کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہے، جو برگزیدگی کے مقامات کے اسرار سے واقف ہے، جو تمام شرفا کا سردار ہے، جو اوصافِ حمیدہ کا مجموعہ ہے جو سب سے بڑا دوست ہے، جو معزز و مکرم محبوب ہے، جو مقامات اور مراتب کی بلندی کی وجہ سے مخصوص ہے، جو براہین ودلالات کے اسلحہ سے لیس ہے، جن کو رعب اور معجزات اس لئے عطا کئے گئے کہ وہ اپنے مشن میں منصور ہوں۔ وہ دائمی جوہرِ شریف، اور وہ سرمدی نورِ قدیم، جن کا اسم گرامی محمدؐ ہے جو محمود ومقبول ہے ایجاد اور موجود دونوں میں، جو شاہد ومشہود دونوں کا فاتح ہے۔)

کبریتِ احمر میں جہاں درودوسلام کا مقام آتا ہے، وہاں سید نا حضرت شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ نے اپنا تمام فکروفن صرف کیا ہے اور کوشش اس بات کی فرمائی ہے کہ دُرود جامع و مانع ہو چنانچہ ایک دُرود یہ ہے

اللھمّ صل علی سید نا محمد عدد ما شاھد تہ الأبصار و سمعتہ الآذان وصل وسلم علیہ عدد من صلی علیہ و صلّ و سلم علیہ عدد من لم یصل علیہ و صل و سلم علیہ کما تحبّ و ترضی أن یصلی علیہ و صل و سلم علیہ کما أمرتنا أن نصلی علیہ و صل و سلم علیہ کما ینبغی أن یصلی علیہ

(الٰہی ہمارے سردار حضرت محمدؐ پر دُرُد دو سلام اتنے بھیج جتنا کہ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے، ان پر اتنے دُرود و سلام بھیج جتنا ان پر آج تک بھیجا گیا ہے، ان پر اتنا دُرود و سلام بھیج جتنا ان پر آج تک نہیں بھیجا گیا، ان پر اتنا دُرود و سلام بھیج جس سے تو راضی اور مطمئن ہو جائے۔ ان پر اتنا دُرود و سلام بھیج جتنا ان پر بھیجنا لازمی اور سزا وار ہے۔)

اس سے زیادہ جامع دُرود کا تصوّر مشکل ہے۔ پھر الفاظ کی نشست اور بلاغت کا کمال بھی ساتھ ساتھ ملاحظہ فرماتے جایئے۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا ہے کہ ممد وح وہ ہے جس کی ہر ادا پر دل و جان قربان کیا جا سکتا ہے اور جس پر خود حسنِ ازل قربان ہے جو باعث تکوینِ روزگار ہے، جو دعائے خلیل ونویدِ مسیحا ہے۔

عربی ادب نعتِ رسول سے بھرا پڑا ہے۔ اِس مقالے میں اس کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ فارسی، اردو اور کشمیری یہ تینوں زبانیں بھی نعتیہ ادب کے سرمایہ سے مالا مال ہیں۔ انشاء اللہ اگر فرصت ملی اور حالات نے اجازت دی تو اس سلسلے میں تین اور مقالے آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں گے، جن میں فارسی اردو اور کشمیری زبانوں کے نعتیہ ادب کا جائزہ لیا جائے گا۔

☆☆☆

نعتیہ ادب

(قسط نمبر۲۔ فارسی کا تتمہ)

عہدِ حاضر نے جہاں سائنس اور جدید علوم کو عروج پر پہنچایا ہے وہاں اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج کا انسان عناصرِ قُدرت پر فتح پانے کی دُھن میں اِس قدر گرمِ خرام ہے کہ وہ خود اپنے مقام کو بھُول چُکا ہے۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور اُسے جانا کہاں ہے۔ یعنی وہ اپنی ہی حکمت کے خم و پیچ میں اس طرح اُلجھ گیا ہے کہ وہ نفع وضرر کا فیصلہ کرنے سے قاصِر ہے۔ اسی ماحول میں اقبالؔ کا پیدا ہونا کچھ کم تعجب خیز نہیں جس کی آنکھوں کو "جلوۂ دانشِ فرنگ"، خیرہ نہ کر سکا۔ جو "خاکِ مدینہ و نجف" کو بدستور اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتا رہا۔

اِس مقالے میں اقبال پر رائے زنی مقصود نہیں بلکہ یہ کہنا ہے کہ عصرِ

حاضر میں سب سے بڑا نعت خواں شاعر اقبالؔ ہے۔ اقبالؔ صرف علومِ مشرقی پر حاوی نہ تھا بلکہ وہ علومِ مغربی میں بھی منتہی تھا۔ اِس طرح وہ مشرق و مغرب کا ایک دلچسپ امتزاج تھا۔ اُس نے یورپ کے علماء کے افکار کو خوب سمجھا تھا۔ مشرق کے علماء کے رشحاتِ فکر سے بھی بخوبی مستفید ہوا تھا۔ علماء یورپ میں سے اُسے نطشےؔ کا تصور مافوق البشر نظر آیا جس سے اگرچہ وہ متاثر ضرور ہوا۔ لیکن وہ اُسے بالکل قبول نہ کر سکا۔ کیونکہ نطشےؔ بشر سے مایوس ہو کر مافوق البشر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اقبالؔ بشر سے مایوس نہ تھا۔ وہ بشر کو خلیفۃ اللہ کہتا اور سمجھتا تھا، لیکن وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ بشر میں وہ کون سی صفات ہونی چاہئیں جن سے وہ خلیفۃ اللہ کے مرتبہ عظیم پر فائز ہو سکتا ہے۔ کافی تفتیش و تحقیق کے بعد اُسے ایک ذاتِ گرامی نظر آئی، جو ہمہ صفت موصوف تھی۔ جس میں خلافتِ الٰہی کے منصب پر فائز ہونے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اور یہ ذاتِ بابرکات خیر البشر کی تھی۔ اِسی ذاتِ گرامی کا نام محمد رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم ہے۔ جن کے بارے میں بالکل بجا طور پر کہا گیا ہے۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

"مقامِ محمدیؐ" کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں۔ اقبالؔ نے اِس دشوار مرحلے کو ضرور طے کیا تھا۔ اُمتِ عربیہ کو خطاب کرتے ہوئے وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتا ہے اور کس دلاویزی سے کہتا ہے

علم و حکمت ریزۂ از خوانِ کیست　　　آیۂ فاصجتم اندر شانِ کیست

از دم سیرابِ آں اُمی لقب　　لالہ رُست از ریگِ صحرائے عرب

حریّت پرورۂ آغوش اوست　　یعنی امروزِ اُمم از دوشِ اوست

اودلے درپیکرِ آدم نہاد　　اونقاب از خلعتِ آدم کُشاد

(مّلتِ عربیہ سے خطاب کرتے ہوئے اقبال اُنہی سے پوچھتے ہیں۔ تُم جو اپنے علم وفضل کے لحاظ سے ساری دُنیا میں مشہور ہوئے، یہ کہاں سے آئے اور یہ کس کی نگاہ کیمیا اثر کا فیضان تھا۔ کیا تُم وہ نہیں ہو جو کل تک ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے۔ اگر ایک صبح تم جاگے تو ایک دوسرے کے دُشمن نہیں بلکہ بھائی تھے آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ بات یہ ہے کہ نبیؐ اُمّی روحی فداہ کی عیسٰے نفسی کا ہی یہ اعجاز تھا کہ عرب کی تپتی ہوئی ریت سے رنگا رنگ پھُول کھِلے۔ وہ ذاتِ پاک جس کی آغوشِ شفقت میں حریّت اور آزادی پروان چڑھی۔ تمام اُمتوں کا حال حضور کے ماضی سے تابناک ہے۔ آپ نے آدم کے جسم میں دل رکھا اور آدم کی حقیقی شکل وصورت سے نقاب اُٹھایا۔)

اقبالؔ سے پہلے نعت خوانی کا کمال صرف اتنا تھا کہ حضور کے ذاتی اوصاف اور محاسن کا ذکر کیا جاتا اور کچھ عرضداشتیں کی جاتیں اور بس۔ اقبالؔ نے حالؔی سے متاثر ہو کر نعت کا رُخ بدل دیا اور کوشش یہ کی کہ پورے خلوص، ذوق اور شوق سے سیرت رسُول کی جھلک دیکھی جا سکے۔ "اسرار و رموز" میں اگرچہ ہر جگہ یہ اشارے موجود ہیں، لیکن یہ براہِ راست نعت ملاحظ فرمایئے جس میں توصیف بھی ہے، تعریف بھی ہے اور ایک حسین التجا بھی۔

سبت معشوقے نہاں اندر دِلت چشم اگرداری بیا بنمایمت
دِل ز عشق اوتوانا مے شود خاک ہمدوش ثریا مے شود
خاکِ نجداز فیض اوچالاک شُد آمد اندر وجد و در افلاک شُد
در دِل مسلم مقام مُصطفیٰ است آبُروئے ماز نام مُصطفیٰ است
طُور موجے از غبارِ خانہ اش کعبہ رابیت الحرم کا شانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش تاجِ کِسرےٰ زیرِ پائے اُمتّش
درشبستانِ مراخلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
ازکلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ہمچو او بطن اُم مادر نہ زاد
درنگاہ اویکے بالا وپست باغلامِ خویش بریک خواں نشست

(اگر تو دیکھے تو تیرے دل میں ایک محبوب موجود ہے۔ کاش تمہارے پاس آنکھیں ہوتیں ۔ میں تمہیں تمہارے دل میں بیٹھے ہوئے محبوب کے دیدار سے سیراب کرتا۔ وہ محبوب تو وہ ہے جس کے عشق سے دل توانا ہوتا ہے۔ اور مٹی ثریا سے ہمکلام ہوتی ہے۔ نجد جو مجنوں اور لیلیٰ کے عشق کی داستان کی سرزمین ہے اِس محبوب کے فیض سے دوبارہ زندہ ہُوا، وجد میں آیا، اور آسمان کا ہم شان ہُوا۔ اِس محبوب کا نام نامی محمد مُصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو ہر مومن کے دِل کا مکین ہے جس کا نام ہمارے لئے آبُرو کا باعث ہے۔ اُن کے کاشانۂ عالی سے دھُول اُڑی تو طُور بنی۔ اُن کا کاشانۂ عالی بیت اللہ کا کعبہ ہے۔ وہ ذاتِ والا صفات جس نے راتوں کی نیند چھوڑ دی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ جس قوم کی طرف وہ

مبعوث ہو کر آئے تھے، وہ تختِ کسرے[1] کی وارث بنی۔ حرا کے غار میں آپ کی گوشہ نشینی کا فیض تھا کہ قوم، آئین اور حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ حضور نے دین و دُنیا کی اقوام کو معتدل فرمایا اور دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا۔ رہبانیت کے ناخن کی قبر میں کیل کیل ٹھونک دی۔ اُونچ نیچ ختم کی۔ رنگ و نسل اور آقا و غلام کی تمیز اُڑا دی اور اپنے غلام کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے۔)

حضور کی سیرت کے یہ روشن واقعات بیان کرنے کے بعد ایک دلاویز التجا بھی کی ہے۔ دیکھئے کیا انداز ہیں۔

در مصافے پیش آں گردوں سریر
دختر سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر وہم بے پردہ بُود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بُود
دخترک راچوں نبیؐ بے پردہ دید
چادرِ خود پیش روئے او کشید
ماازاں خاتُونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چارہ یم
روزِ محشر اعتبارِ ماست رُو
ہم بدنیا پردہ دارِ باست رُو

(ایک جنگ میں اس شہنشاہ آسمان جاہ کے پاس حاتم طائی کی بیٹی قید ہو کر آئی۔ حضور نے اُسے زنجیروں میں جکڑا دیکھا اور وہ بے پردہ بھی تھی۔ شان نبوّت نے یہ گوارا نہ کیا اور آپ نے اپنی ردائے مُبارک سے اُس کا چہرہ ڈھک لیا۔ آج حضور کی اُمت حاتم طائی کی بیٹی سے بھی زیادہ بے پردہ ہو گئی ہے، اور اقوامِ عالم کے سامنے ننگی اور عریاں ہو گئی ہے۔ قیامت میں بھی ہمارا اعتبار حضور

ہی کے وجود ذی جود سے ہے اور دُنیا میں بھی ہمارا پردہ قائم ہے تو آپ ہی کے طفیل) اِس لطیف التجا کے بعد پھر اسوۂ حسنہ کا ذکر ہے اور فرماتے ہیں ۔

آنکہ برا عداء در رحمت کشاد | مکّہ راپیغام لاتثریب داد
امتیازاتِ نسبِ پاک سوخت | آتشِ او ایں خس و خاشاک سوخت

حضور نے اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی مرّوت اور شفقت کا سلوک فرمایا، جب آپ مکّہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے تشریف لائے تو وہ سب لوگ جنھوں نے آپ کو ایذائیں پہنچائی تھیں، جنھوں نے آپ کو وطن سے نکالا تھا۔ مغلوب ہو کر پیش کئے گئے۔ حضور نے ان سب کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ "ماذا تظنّونی"۔ کہو آج تُم مُجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو اور میرے متعلق کیا گمان رکھتے ہو۔ وہ سب یک زبان ہو کے بولے۔ "أخ کریم ابن أخ کریم" آپ تو ہمارے فیاض بھائی ہیں اور ہمارے فیاض بھائی کے بیٹے۔ حضور نے فرمایا "لا تثریب علیکم الیوم، اذھبوا فأنتم الطلقاء" تُم سے کوئی باز پُرس نہ ہوگی، جاؤ میں نے تُم سب کو آزاد کر دیا۔

قریشِ مکّہ کی سب سے بڑی شکایت حضور سے یہی تھی کہ انھوں نے قریش کے نسلی خبط کا جنازہ نکال دیا تھا۔ "جاوید نامہ" میں "نوحۂ ابوجہل" کے عنوان سے جو دلفریب نظم ہے، اُس میں ابوجہل کی زبانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ کہلوایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابوجہل یہ ساری باتیں اپنے خداوؤں کے سامنے شکایتاً بیان کر رہا ہے:

سینہ ما از محمدؐ داغ داغ   از دمِ اوکعبہ راگُل شد چراغ
اسوداں با احمراں آمیختند   آبروئے دود مانے ریختند

(یعنی معاز اللہ ابوجہل کا یہ خیال ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ نے گوروں کالوں کو ایک صف میں بٹھا دیا، اِس لئے کعبے کا چراغ گل ہوا) اقبالؔ کے فن کی چابک دستی یہ ہے کہ سب سے بڑے دُشمن اسلام کی زبان سے بھی سیرت رسُول کے دلاویز پہلوؤں کا اعتراف کراتا ہے۔ یہ نعت کا نیا انداز اور مدح کی بالکل نئی تکنیک ہے، جو اقبالؔ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، اِس لئے کہ اقبالؔ علوم قدیم و جدید پر بخوبی حاوی ہے۔

"رموزِ بیخودی" میں رسالت کی اہمیت اور صاحبِ رسالت کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول نہ ہوتے تو ایمان نہ ہوتا، ایمان نہ ہوتا تو توحید کی تعلیم عام نہ ہوئی ہوتی۔

معنی حرفم کنی تحقیق اگر   بنگری بادیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب وجگر گردد نبیؐ   از خُدا محبوب ترگر دد نبیؐ

(یعنی میری بات پر اگر تُم غور کرو، اور مقامِ رسالت کو پہچاننے کے لئے صدیقِ اکبر رضی اللہ کا قلب وجگر تلاش کرو تو نبیؐ تمہاری رُوح کا سہارا بنے گا۔ اور خُدا سے بھی زیادہ پیارا ہوگا۔)

اقبالؔ نے اس مضمون کو آگے جا کر اپنی دوسری کتابوں خاص کر "ارمغان حجاز" میں اور بھی پھیلا دیا ہے۔ اُن کے سامنے قرآن حکیم کا یہ ارشاد۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ ہمیشہ رہا اِسی لئے حُبِ رسُول اور اطاعت رسُولؐ کو انھوں نے حُبِ ایزدی اور اطاعت ایزدی سے زیادہ ضروری جانا اِس لئے خُدانخواستہ توحید کا مقام گھٹانا مقصود نہ تھا۔ نہ نبی کا درجہ خُدا سے بڑھانا مطلوب تھا۔ بلکہ اقبالؔ کا استدلال یہ ہے کہ توحید کو سمجھا نہیں جا سکتا جب تک مقامِ رسالت سمجھ میں نہ آئے۔ خُدائے بُزرگ و برتر کی اطاعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک رسُول کی اطاعت مکمل نہ ہو۔ حُبِ ایزدی کی بنیاد حُبِ نبیؐ ہے، اور جب تک نبی خدائے بُزرگ سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو، عشقِ الٰہی کا دروازہ کھُل نہیں سکتا۔ اقبالؔ کا خیال ہے کہ عبدومعبود کا باہمی تعلق اگرچہ زبردست ہے۔ اِس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے۔ کہ عبد نہ معبود کے صحیح مقام کو پہچان سکتا ہے نہ خود معبود ہی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ اِس لئے کہ عبدِ مطلق اور عبدِ خاص محمد رسُول اللہ کے برابر اور کوئی نہ ہوسکا۔ اِس کے باوجود وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف یہ کہہ کر فرماتے ہیں۔

"الٰہی تو پاک ہے۔ میں نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا۔" اقبالؔ کہتے ہیں جب رسُولِ برحق ایسا عبدِ خاص بھی خدائے برحق کی عبادت کا حق ادا نہ کر سکے تو اور کون ہے جو اس کا دعوے کر سکتا ہے۔ اسی لئے وہ چاہتے ہیں کہ انسان کے سامنے رسالت کا مقام ہی رہے۔ اُس کی پرواز صرف مقامِ رسُول کو سمجھنے تک ہی مصروف رہے۔ یہی خُداشناسی ہوگی۔ یہی ارشاد ہوا ہے اِس مصرع میں:

از خُدا محبوب تر گردد نبیؐ

"ارمغان حجاز" میں فرمایا:

مسلماں راہمیں عرفان و ادراک
که از خود فاش بیند سرِ لولاک
خُدا اندر قیاس ما نگنجد
شناس او را که گوید ماعرفناک

(مسلمان کا عرفان و ادراک بس صرف اتنا ہے کہ وہ مقامِ رسالت کو پہچانے، اِس لئے کہ خدائے بُزرگ کی جلالت و عظمت ہمارے چھوٹے سے قیاس کی سرحدوں میں سمانہیں سکتی۔ اب اِس کا حل یہی ہے کہ اُس ذاتِ بابرکات کو سمجھا جائے جس نے عبادت کے تمام حقوق ادا کرنے کے بعد اپنے عجز کا اعلان کیا اور فرمایا: "سبحانک ماعبدناك حق عبادتک۔" اِسی ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ کہتے ہیں:

بکوئے تو گدازِ یک نوابس
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس
خراب جراتِ آں زیدپا کم
خُدا راگفت مارا مُصطفیٰ بس

یا رسول اللہ۔ آپ کے کُوچے میں مجھے ایک آہ کرنے کا گداز حاصل ہو جائے، میرے لئے یہی ابتدا اور یہی انتہا کافی ہے۔ میں تو اِس مقدس دیوانے کی جُرأت کا عاشق ہوں جس نے خدا سے کہا کہ ہمیں محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کافی ہیں اور کسی کی ضرورت نہیں۔

ہمارا قیاس، ہماری عقل اور ہمارا تخیل خُدائے بُزرگ کی عظمت و جلالت کا احاطہ نہیں کرسکتی، اِس کے باوجود ہم توحید پرست ہیں۔ خُدا کے قائل ہیں، اُس کو معبود مطلق جانتے ہیں، کیوں؟ اِس کا جواب بھی اقبال سے سُنئے

دراں دریا کہ اور اسا حلے نیست　　دلیل عاشقاں غیراز دِلے نیست
تو فرمُودی رہِ بطحا گرفیتم　　وگرنہ جُز تو مارا منزلے نیست

ایک ناپیدا کنار سمندر میں عاشق کی رہنمائی "دل" کے سوا اور کوئی نہیں کرتا۔ یا رسول اللہ۔ آپ نے حُکم دیا ہے تو ہم کعبہ کی طرف جھُکتے ہیں۔ ہماری منزلِ مقصود تو آپ کی ذاتِ گرامی کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اور پھر فیضان رِسالت کا یہ عالم ہے:

زنورِ تو برافروزم نگہ را　　کہ بنیم اندرُونِ مہرو مہ را
چومیگویم مُسلمانمِ بلرزم　　کہ دانم مشکلاتِ لا الہ را

آپ ہی کا فیضاں نظر ہے کہ میری نظر اِس قدر تیز ہے کہ میں چاند سورج کے آرپار دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن جانتا ہوں کہ لا الہ کہنا کتنا دشوار ہے، مسلمان ہونا کتنا مشکل ہے، اِس تصوّر سے ہی کانپ جاتا ہوں۔

ایک بات کو صاف کرنا ضروری ہے کہ محمدؐ رسُول اللہ روحی فداہ کے متعلق ہر مسلمان کا اعتقاد ہے۔

بعد از خُدا بُزرگ توئی قصّہ مختصر

قدرتاً اقبالؔ بھی اس عقیدے پر قائم تھے، مگر اُن میں اور عام مُسلمانوں میں فرق یہ ہے کہ عام مُسلمان یہ اصُول اعتقاداً مانتے ہیں۔ اقبال اِس عقیدے پر تحقیقاً قائم تھے۔ اِس سے پہلے کہہ چُکا ہوں کہ انھوں نے کافی غور وخوض کے بعد عالم اِنسانی کی نجات کے لئے ایک نمونے کو اپنے سامنے رکھا تھا۔ اور یہ نمونہ حضرتِ

خیرالبشر کی ذاتِ بابرکات تھی۔ اسوۂ رسُول کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی اقبال نے تسلیم کیا تھا کہ۔

بعد از خُدا بزرگ توئی قِصّہ مختصر

مثلاً اقبال کے سامنے غلامی انسانیت کی سب سے بڑی توہین اور سب سے بڑی لعنت ہے۔ غلامی چاہے، انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا اقتصادی، روحانی ہو یا ذہنی نا قابل برداشت ہے۔ اقبال کو اسوۂ رسُول کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ حضور کی تعلیم ہر نوع کی غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ وہ ملوکیت کو غلامی کا جنم داتا سمجھتے ہیں، اِس لئے ملوکیت کے ساتھ انھیں شدید عداوت ہے۔ اسوہ رسُول میں انھیں ملوکیت کا تصور کہیں نہیں ملتا۔ اور اُس کا سر حضور کے سامنے جھک جاتا ہے۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش نا تمام است
غلام فقرِ آں گیتی پنا ہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

اِسی طرح وہ جہانِ شوق کو تکمیل انسانیت کا اعلےٰ درجہ تصّور کرتے ہیں۔ عشق کا تصور بھی اقبال نے بدل دیا ہے۔ اِس کے عام اور پٹے ہوئے معنوں سے ہٹ کر انھوں نے کسی مرد کامل کی تقلید کامل کا نام عشق رکھا ہے۔ عشق ایک نصب العین ہے جس کے حصول کے لئے انسان کسی مصلحت کا قائل نہیں رہتا۔ کسی جسمانی آزار سے نہیں گھبراتا اور مشکلات کے ہجوم میں بھی کوہِ وقار کی طرح ڈٹا رہتا ہے۔ حضور کی سیرت سے اقبال کو معلوم ہوا ہے کہ یہ صفت اگر تمام و کمال

کہیں پائی جاتی ہے تو وہی دربار ہے:

محبت از نِگاہش پائیدار است | سلوکش عشق و مستی راعیار است
مقامش عبدہ، آمد ولیکن | جہانِ شوق را پرور دِگار است

حضور رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ مسلمانوں کو جو عقیدت ہے، اُس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی۔ حضور کی تعلیمات میں اکثر اِس بات پر زور دیا گیا ہے۔ کہ غلبہ حبِ رسول کے جذبے سے سرشار ہو کر مسلمان کہیں افراط و تفریط میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ قرآن میں بھی بار بار ارشاد ہُوا ہے کہ آپ اِن لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ میں تو صرف ایک نبی ہوں اور تمہارے سامنے میں وہی بات رکھتا ہوں جس کا مجھے حُکم دیا گیا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود مسلمانوں کے دلوں میں حضور پرنُور کی عقیدت اتنی بے پناہ ہے کہ بعض دفعہ لوگ ان قطعی ارشادات کی روح کے منافی کام کرتے ہیں۔ یہ غلبہ حُبِ رسُول ہے اور اِس کا ہونا ضروری بھی ہے۔

مسلمانوں میں ایک متنازعہ مسئلہ حیات نبوی کا بھی ہے۔ سخت قسم کے توحید پرست یقین رکھتے ہیں کہ حضور کے اِس عالم فانی سے نقل کرنے کے بعد اُن سے خطاب کرنا یا انھیں زندہ سمجھنا خُدا کا شریک ٹھہرانا ہے۔ لیکن اقبالؔ اِس مسلک کے قائل نہیں۔ وُہ حضور کے حیات ظاہری کے اختتام کو اُن کی موت نہیں

سمجھتے۔ وہ حضور کو زندہ جاوید سمجھتے ہیں اور صاف صاف الفاظ میں کہتے ہیں:

یا خُدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ پنہاں وتو پیدائے من

نعتوں میں جہاں جہاں اقبال نے حضور علیہ السلام سے التجائیں کی ہیں، وہاں کہیں یہ بات اشارتاً بھی نہیں ملتی کہ اُن کے دل میں حیاتِ نبوی کے متعلق ذرا سا بھی شک ہے۔ ایک نعت میں اقبال نے اپنی صحت کے بارے میں التجا کی ہے۔ اِس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

آہ ازاں در دے کہ درجان وتن است
گوشہ چشم تو داروئے من است
ورنسا زد با دواء جانِ زار
تلخ بویش بر مشامم ناگوار
کار ایں بیمار نتواں بردپیش
من چوطفلاں نالم از دروئے خویش
تلخے اور افزائم از شکر
خندہ ہا درلب بدوز دچارہ گر
چوں بصیری ہے از تومے خواہم کشود
تابمن بازآیدآں روزے کہ بود

فرماتے ہیں۔ یا رسول اللہ میرے جان وتن میں جو کرب آفرین درد ہے اُس کا علاج آپ کی توجہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ دواؤں کے ساتھ میری برابری نہیں، اُن کی کڑواہٹ اور بدبو سے میری جان پر بن آئی ہے۔ بیماری نے مجھے بچوں کی طرح بے صبر اور ندیدہ بنا دیا ہے۔ دواؤں کی کڑواہٹ کو دُور کرنے کے لئے اس کے ساتھ شکر ملاتا ہوں تو میرا طبیب بھی میری ان طفلانہ حرکتوں کو دیکھ کر اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا رسُول اللہ! میرے ساتھ دہی عنایت

فرمایئے جو آپ نے بوصیری کے ساتھ فرمائی تھی۔ تا کہ میں پھر وہ دن دیکھ سکوں جو گذر چکے ہیں۔

(بصیری کا واقعہ اسی مضمون کی قسط نمبر ا میں تفصیل سے آچکا ہے۔)

اِن اشعار کے مطالعہ کے بعد صاف صاف یہ بات نظر آتی ہے کہ اقبال رسُولِ مقبول کوحی و قیوم سمجھتے ہیں اور یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور علیہ الصلواۃ و السلام کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہیں مُردہ کو زندہ کریں، خاک کو کیمیا بنا دیں۔ مکھی کو شاہباز کی پرواز بخشیں۔ کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نعتوں میں التجاؤں کا انداز مناجات کا سا ہے۔ اور وہ اِس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ مولانا فریدالدین عطار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حمد بے حد بر خُدائے پاک را
آنکہ ایماں دادمشتِ خاک را

اقبال عطارؒ کے اِس شعر میں ترمیم کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

حمدِ بے حد بر رسُولِ پاک را
آنکہ ایماں دادمشتِ خاک را

بالکل منطقی انداز سے سوچا جائے تو اقبال کا نظریہ غلط نہیں۔ کیونکہ ایمان کی دولت سے عالم انسانیت کو اگر باخبر کیا ہے تو وہ رسول نے ہی کیا ہے۔ ایمان عرفان کا سرچشمہ ہے۔ لیکن اِس سرچشمے کی طرف راہبری کرنے والا بھی تو ہو۔ اِس کی

تصدیق قرآنِ حکیم کے اِس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ بندوں سے پوچھیں گے۔ "الم یأتکم نذیر"۔ کیا تمہارے پاس میری طرف سے ڈرانے والا نہیں آیا؟ یہی ڈرانے والا اور خوشخبری سُنانے والا ایمان کی طرف راہ دکھانے والا ہے، اور اس لحاظ سے:

حمدِ بے حد بر رسُولِ پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

کہنا بالکل بجا اور موزوں ہے۔ اللہ جل شانہ اگر براہ راست اپنے بندوں کے دلوں کو نُورِ ایمان سے منّور فرمانے کا ارادہ رکھتے تو نبیوں، رسولوں، رہنماؤں اور اوتاروں کے وقتاً فوقتاً آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جو لوگ اقبال کو جذبہ حُبِ رسول میں خالی سمجھتے ہیں اُن کے لئے شاید یہ دلیل شافی ہوسکتی ہے اور اسی معنی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ اِس دلپذیر شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔

مے توانی منکرِ یزداں شُدن
مُنکرِ شانِ نبیؐ نتواں شُدن

اقبالؔ کی نعتوں کا انداز روائتی نعت خوانی سے بالکل جُدا ہوا ہے۔ انھوں نے نعتوں میں سیرتِ رسُول کا خاکہ پیش کر کے ایک تبلیغی کام سر انجام دیا ہے۔ یہ وصف اقبال کو اس لئے حاصل ہے کہ وہ خالص مُلّا نہ تھے۔ عہد حاضر کے علوم پر کما حقّہ حاوی تھے۔ اسلامی روایات و علوم کے دلدادہ اور ذاتِ نبوی کے والہ و شیفتہ تھے۔ قدیم و جدید کے اِس امتزاج نے اقبال کو اپنا ایک خاص مقام عطا کیا

ہے۔ قدسی نے رسُول اکرمؐ کے متعلق فرمایا تھا:

بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

اقبال کے بارے میں بھی یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ نعت کی صنف کو انھوں نے جو نیا رنگ اور جو معنی بخشے وہ اس کے پہلے کے نعت خوانوں کے وہم میں بھی نہ آسکتے تھے۔ اِس رنگ میں وہ لاثانی ہیں۔ اُن کا مقام اپنا ہے اور کوئی اِس مقام کو چھین نہیں سکتا۔ زمانے کی گردش کے ساتھ ساتھ شاید اور لوگ بھی پیدا ہوں، مگر تقدم اور اوّلیت کا شرف اقبال ہی کو حاصل رہے گا۔

اِس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ارمغانِ حجاز کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اِس کتاب میں جو اقبال کی آخری تصنیف ہے، اقبال نے ایک حصہ "حضُور رسالت" کے عنوان سے معنون کیا ہے۔ اِس حصے کی ابتدا میں اقبال نے عزت بخاری کا یہ شعر لکھا ہے:

ادب گاہے است زیرِ آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و با یزید اینجا

"حضُورِ رسالت" ایک مسلسل مضمون پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ ایک مسلسل نظم کی صورت میں نہیں۔ مضمون یہ ہے کہ ایک عاشق رسُول دیارِ حبیب کا سفر کرتا ہے، وہاں پہنچتا ہے اور پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اپنی تمنائیں عرض کرتا ہے۔ اِس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے عاشق کے دل کی کیفیات کیا تھی، خود سفر میں دل کا کیا حال تھا، اور پھر جب حضورِ رسالت میں باریابی ہوئی تو جذبات کے

تلاطم کا کیا انداز تھا۔ یہ سب کیفیتیں ایک ایسے دلاویز نغمے کی صورت اختیار کرتی ہیں جو دِل کے ساتھ پیوست ہو جاتا ہے۔ آنکھیں نمناک ، دِل پُرسوز اور جگر خُون ہو کر رہ جاتا ہے۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کی کیفیت کا ایک منظر دیکھئے۔

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم   نواخواں از سرودِ عاشقانہ
چوآں مرغے کہ درصحرا سرِشام   کشاید پر بفکرِ آشیانہ

بڑھاپے میں عاشقانہ گیت گاتے گاتے یثرب کی طرف روانہ ہو رہا ہوں، اُس پرندے کی طرح جو سارا دن صحراؤں میں گزار کر شام کے وقت اپنے آشیانے کی طرف جانے کے لئے پر تولنے لگتا ہے۔

اور پھر عین سفر کی ایک دلاویز صورت بھی ملاحظ فرمایئے:

سحر باناقہ گفتم نرم تررو   کہ راکب خستہ و بیمار وپیراست
قدم مستانہ زدچند انکہ گوئی   بپایش ریگِ ایں صحرا حریراست

میں نے اُونٹنی سے کہا کہ تیرا سوار تھکا ہوا، بیمار اور بوڑھا ہے۔ ذرا آہستہ چل۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ جھوم اُٹھی، اور پہلے سے بھی زیادہ تیز چلنے لگی، جیسے صحرا کی ریت نہ تھی اُس کے قدموں کے نیچے ریشم کا فرش تھا۔ اِس کا سبب؟ وُہ بھی سنئے:

مہار اے سارباں اورا نشاید   کہ جان اوچو جانِ من بصیراست
من از موجِ خرامش مے شناسم   چومن اندر طِلسم دل اسیراست

میں نے اس کے بعد ساربان سے کہا کہ اونٹنی کو اپنے حال پر چھوڑ دو، اُس کی

مہار نہ پکڑو، اونٹنی بے قابو ہوئی جاتی ہے۔ میں اس کا راز پا گیا ہوں۔ یہ بھی دیارِ حبیب پر پہنچنے کے لئے میری طرح ناصبور ہے۔ یہ غریب بھی میری ہی طرح دِل کے ہاتھوں مجبور ہے:

نیم اشک است در چشمِ سیاہش　　دلم سوزد ز آہ صبح گاہش
ہماں مے کو ضمیرم رابر افروخت　　پیاپے ریزد از موجِ نگاہش

کیا تُم نہیں دیکھتے اِس کی آنکھیں غمناک ہیں، کیا تُم نہیں سُنتے یہ آہ فریاد کر رہی ہے۔ ارے یہ تو وہی شراب ہے جس نے میرے ضمیر کو تابناک کیا ہے اور جو اب اِس اونٹنی کی موجِ نگاہ سے برابر ٹپک رہی ہے۔

آیئے اب ذرا اُس صحرا کی بھی ایک جھلک دیکھیں جس کی شامیں صبحوں سے زیادہ آئینہ فام ہیں، جس میں مدینے کا مسافر سفر کر رہا ہے، اور دِل کے دروازے کھول رہا ہے۔

چہ خوش صحرا کہ دروے کا روانہا　　درودے خواند و محمل براند
نہ ریگِ گرم او آوز سُجودے　　جبیں راسوز تا داغے بماند

سبحان اللہ کیا صحرا ہے۔ کاروان کے کاروان جا رہے ہیں۔ درود پڑھتے ہیں اور اونٹوں کو ہانکتے ہیں۔ آو اِس صحرا میں گرم گرم ریت پر ایک سجدہ کریں، تا کہ ماتھا جل جائے اور اس پر یادگار کے طور پر ایک داغ باقی رہ جائے۔

تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں اِس لئے بہت کم نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ صحرا کا سفر ختم کرنے کے بعد آخر نوبت دربارِ نبوی میں حاضر ہونے

کی آتی ہے۔ اس وقت جذبات کا کیا عالم ہو گا، اُس کا احاطہ ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ مگر اقبالؔ ایسے چابک دست کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں۔ دیکھئے اور اپنے ذوقِ لطیف کی بالیدگی کا سامان کیجئے:

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم　　من و تُو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مُراد دِل بگویَم　　بپائے خواجہؑ چشماں رابمالیم

☆

حکیماں را بہا کمتر نہا دند　　بنا داں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے چہ خرم روز گارے　　درسلطان بدرویشے کشاوند

☆

جہانِ چار سو اندر برِمن　　ہوائے لامکاں اندر سرِمن
چوبگذشتم ازیں بام بلندے　　چوگرد افتاد پرواز از پرِمن

☆

درِیں وادی زمانی جاودانی　　زخاکش بے صُور روید معانی
حکیماں باکلیماں دوش بادوش　　کہ اینجاکس نگوید لن ترانی

(اے ہم نفس آ۔مِل کر آہ زاری کریں۔ ہم دونوں ایک ہی شمع رسالت کے پروانے ہیں۔ آج موقعہ مِلا ہے کہ دِل کی بات زبان پر لائیں اور حضور روحی فداہ کے پائے مقدس کے نیچے اپنی آنکھیں بچھادیں۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ یہاں حکمت و دانائی کی کوئی قیمت نہیں، البتہ جُنونِ عشق کی بڑی قیمت ہے۔ حکیم اپنی

حکمت کے خم و پیچ سلجھا رہا ہے، اور مجھ ایسا نادان جلوۂ دوست کی دولتِ بے پایاں سے بہرہ اندوز ہو رہا ہے۔ کیا اِس وقت کی سعادت کا کوئی جواب ہے کہ جب ایک سُلطان کا دروازہ کھُل جائے، اور ایک فقیر کم مایہ کو باریابی کی دولت حاصل ہو جائے، یہ تو وہ ہے جب سارا جہانِ چارسو میرے آغوش میں ہے کہ لامکان کی ہوا میرے سر میں سمائی ہے۔ میری پرواز اتنی اُونچی ہے کہ خُود طاقت پرواز بھی میرے پروں سے گر پڑی ہے۔ یہ وہ وادی ہے جو زمان و مکان کے حدوُد سے باہر ہے۔ اس کی مٹی سے معانی پیدا ہوتے ہیں جن کی کوئی صُورت نہیں۔ یہاں دانا اور نادان میں کوئی امتیاز نہیں۔ یہاں رحمتِ عام کا یہ عالم ہے کہ آج تک لن ترانی کا جواب کسی کو نہ ملا۔ جو آتا ہے، دیدار کی دولتِ سرمدی سے فیضیاب ہو کر جاتا ہے۔)

اس کے بعد التجاؤں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ قبل اِس کے کہ میں چند نمونے پیش کروں، یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اقبال کی التجائیں بہت کم ایسی ہیں جن میں محض اپنی ذات کی فلاح مقصُود ہو۔ اقبال جب بارگاہِ رسالت میں معروضات پیش کرتے ہیں تو اُن کے سامنے سارا عالم اِنسانیت ہوتا ہے۔ اقبال کا پُختہ عقیدہ ہے کہ محمد عربیؐ کے پیغام میں دُنیا کی نجات ہے، کیونکہ اسلام امن و صلح اور آشتی کا پیغام ہے۔ اسی لئے وہ پیغامِ محمدؐ کو عام کرتے ہیں۔ وہ دیانتداری سے سمجھتے ہیں کہ محمدؐ کے پیغام میں رِستے ہوئے ناسُور کا علاج ہے۔ قوموں کی باہمی بے اعتمادی، افراد کی بے راہ روی خانہ جنگی اور آپادھاپی، خُون خرابہ اور

دھینگا مُشتی کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہو تو محمدؐ کے پیغام پر خلوص دِل سے عمل کیا جائے۔ اِس بات کو ذہن میں رکھئے اور یہ چند التجائیں، اُن کا خلُوص اور اُن کا انداز ملاحظہ فرمائیے:

هنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است | هنوز ایں کارواں دُور از مقام است
زکارِ بے نظامِ خُودچہ گویم | تو میدانی کہ ملّت بے امام است

☆

ملوکیت سراپا شیشہ بازی است | از و ایمن نہ رومی نے حجازی است
حضُور تو غم یاراں بگویم | بہ امیدی کہ وقتِ دلنوازی است

☆

جبیں راپیش غیر اللہ سودیم | چو گبراں درحضورِ او سرودیم
ننالم از کسے می نالم از خویش | کہ ماشایانِ شانِ تو نبودیم

☆

مُسلماناں بخویشاں در ستیز ند | بجز نقشِ دوئی بر دِل نریزند
بنا لندار کسے خشتے بگیرو | ازاں مسجد کہ خوداز وے گریزند

☆

سبوئے خانقاہاں خالی از مے | کُند مکتب رہِ طے کردہ راطے
زبزمِ شاعراں افسردہ رفتم | نواہا مردہ بیروں اُفتداز نے

☆

مرا تنہائی آہ وفغاں بہ — سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب کجا میخانہ شوق — تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

☆

بہ آں رازے کہ گفتم پے نبردند — زشاخ نخلِ نے خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم — مرایاراں غزل خوانے شمردند

☆

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئی — بگوش مردۂ اسرار جاں گوئی
ولے گویند ایں حق ناشناساں — کہ تاریخِ وفات ایں وآں گوئی

☆

زخم از دردِ پنہاں زعفرانی — ترا ودخون بچشم ارغوانی
سخن اندر گلوئی نے گرہ بست — تو احوال مرا نا گفتہ دانی

☆

مے از مے خانہ مغرب چشیدم — بجان من کہ دردِ سر خریدم
نشستم بانکو یانِ فرنگی — ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

☆

التجاؤں کا یہ سلسلہ بے حد طویل ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اِن التجاؤں میں جہاں ملوکیت سے نجات کی درخواست ہے عالم انسانیت کی بدنظمی کی شکایت ہے۔ انسان کے غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا رونا ہے۔ آدمی

کے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہونے کی دردناک داستاں ہے، وہاں یہ اشارہ بھی صاف اور واضح ہے کہ وہی مسلمان جو اگر کسی غیر مُسلم کو مسجد کی ایک اینٹ چُراتے دیکھتا ہے تو فساد کرتا ہے،خود سجدے کی نعمت سے محروم ہے اور مسجد کی عظمت سے نابلد۔ خانقاہوں میں بے سوز صوفی بیٹھے ہیں۔ مُلا تحصیل حاصل کرا رہے ہیں۔ شاعر موت اور افسردگی کے راگ الاپ رہے ہیں، اور حضور رسالت میں التجا ہے کہ کوئی ایسا انقلاب آئے، ایک ایسی گردش رُونما ہو کہ یہ ساری باتیں جائیں اور انسان پھر ایک مرتبہ اسی رتبے پر فائز ہو جائے جو اُس کے لئے روز آفرینش مقدر ہو چُکا تھا۔ ان التجاؤں میں آفاقیت اور ہمہ گیری ہے۔ اقبال دربار رسالت سے اپنے لئے ضرور شرح صدر اور کشود مانگتے ہیں۔ اپنے درد کا مداوا طلب کرتے ہیں، مگر وہ اِس دربار کی عظمت سے واقف ہیں، اِسی لئے ان کی التجائیں بھی چھوٹی چھوٹی نہیں، اُن کی حاجات بھی گھریلو قسم کی نہیں وہ غم کو ایک لازوال دولت سمجھتے ہیں، مگر نمک تیل اور لکڑی کے غم کو وہ شایان دِل نہیں سمجھتے۔ وہ جب اپنی ذات کے لئے حضور رسالت سے کچھ مانگتے ہیں تو وہ یہ چیز مانگتے ہیں:

ہمیں یک آرزُو دارم کہ جاوید
زعشقِ تو بگیرد رنگ و بُوئے

یارسُول اللہ۔ میری التجا قبول فرمائیے۔ جاوید کو اپنے عشق میں گرفتار کر دیجئے۔

جاوید کو مخاطب کر کے اقبال نے ہمیشہ نژادِ نو یعنی نئی پود سے خطاب کیا ہے، اِس

لئے اگر وہ جاوید کے لئے عشق رسُول کی گرفتاری چاہتے ہیں تو وہ نثرادنو کے لئے یہ دعا کرتے ہیں۔ یہ التجا بھی ذاتی ہونے کے باوجود آفاق گیر ہے۔

اقبال نے سیاسی، مجلسی، اقتصادی، معاشرتی غرض تمام ذاتی موضوعوں پر لکھا ہے۔مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن کے فکر کا محور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذاتِ والا صفات ہے۔ گھُوم پھر کر وہ اسی موضوع پر آتے ہیں۔ "ابلیس کی مجلس شورے'" ہو یا "خضرِ راہ"، "زبورِعجم" کی غزلیں ہوں یا "بالِ جبریل" کی "مسجدِ قرطبہ"۔ رسُول کریم کی ذات کبھی اُن کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوئی۔ اِس لئے کہ:

یا رسُول اللہ او پنہاں وتو پیدائے من

اقبال کے لوح دل پر کُندہ تھا۔ اور وہ لفظاً ونعتاً اِس عقیدے کے قائل تھے۔جس کا مختلف انداز سے اظہار کر چکے ہیں۔

می توانی منکرِ یزداں شُدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شُدن

☆☆☆

سیرت رسول ﷺ...... دُعاؤں کی روشنی میں

دُعا کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اَلدُّ عَاءُ مُخُّ اَلْعِبَادَۃ یعنے دُعا عبادت کا مغز ہے۔ ایک اور ارشاد میں فرمایا گیا ہے، اُدعُونی اَستجِب لَکُم ''مجھ سے مانگو میں ہی تمہاری دُعا قبول کروں گا''۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ خود اللہ شانہٗ نے قرآن حکیم یعنی وحی جلی کے ذریعے سے بے شمار دُعائیں سکھائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید اور احادیثِ رسول ﷺ میں جو دُعائیں موجود ہیں وہ صرف ہماری رہنمائی کے لئے کی گئی ہیں نہیں تو اللہ تعالیٰ کو دُعا کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ العیاذ باللہ کیا وہ ہمارے محتاج ہیں اور اسی طرح رسولِ مقبول ﷺ نے جو دُعائیں ارشاد کی ہیں وہ ہماری ضروریات کو سامنے رکھ کر ہماری ہدایت اور رہبری کے لئے کی ہیں۔ مولانا روم قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ انسان کی ہر دُعا قبول ہو جاتی ہے کیونکہ دُعا کرنے کی توفیق اللہ جل شانہٗ عطا فرماتے ہیں اور وہ یہ توفیق

اُسی وقت بندے کو دیتے ہیں جب اس کی قبولیت اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ بعض دُعاؤں کی قبولیت کا اثر فوری طور پر ہوتا ہے اور بعض کا دیر سے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ جو دُعائیں دُنیا میں قبول نہیں ہوتیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ رہتی ہیں اور وہ اپنے فضل و کرم سے ان دُعاؤں کو بندے کے حسنات میں شامل فرماتا ہے۔ قیامت کے دن جب بندہ ان دعاؤں کا ذخیرہ اپنے نیک اعمال میں دیکھے گا تو اسے افسوس ہوگا کہ اُس کی بعض دعائیں دنیا میں کیوں قبول ہوئی تھیں، نہیں تو آج وہ بھی میرے ذخیرۂ حسنات میں ہوتیں اور میزان میں میرا پلہ اور بھی بھاری ہوتا۔ اسی لئے ارشاد ہوا ہے کہ دُعا ہی عبادت ہے، بلکہ دُعا عبادت کا مغز ہے۔

دُعا واقعی عجب چیز ہے کہ یہ عبد اور معبود کو ملانے کا براہِ راست ذریعہ ہے۔ کوئی نماز اُس وقت تک نماز نہیں ہوگی جب تک اس میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت نہ کی جائے، اور سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تمجید و تمجید کے فوراً بعد دُعا شروع ہوتی ہے ۔۔۔۔ اہدنا الصراط المستقیم ''بتلا دیجئے ہم کو راستہ سیدھا'' اس طرح سے بندہ مولیٰ کا براہِ راست رابطہ قائم ہوجاتا ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بندہ اپنی ضرورتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور وہ اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر دُعائیں بھی کرتا ہے تو پھر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو ہمیں یہ دُعائیں سکھانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کی نظر محدود ہے اور وہ بعض دفعہ خیر سمجھ کر شر کی دُعا کرتا ہے۔

بزرگوں نے ایک خوبصورت مثال دے کر اس بات کو سمجھایا ہے۔ ایک ضرورت مند آدمی ایک با اختیار افسر کے پاس جا کر اپنی حاجت بیان کرتا ہے۔ افسر اس بات سے متاثر ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کی مدد کرنی چاہیئے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ جاؤ درخواست لکھ لاؤ، سائل جانے لگتا ہے تو افسر اُسے واپس بُلا تا ہے اور کہتا ہے بیٹھو، قلم ہاتھ میں لو۔ میں درخواست کا مضمون تمہیں خود Dictate کروں گا، افسر ایسا اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کی مدد کرنا چاہتا ہے اور اُسے اندیشہ ہے کہ نہ معلوم یہ آدمی اپنی درخواست میں کیا لکھ لائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اُس میں کوئی قانونی سقم ہو اور میں اس کی مدد نہ کرسکوں اسی لئے وہ اسے درخواست کا مضمون خود Dictate کراتا ہے تاکہ اس میں کوئی سقم نہ رہے اور وہ اس کی عرضداشت کو بلا دِقت منظور کر سکے۔ خدا اور رسول ﷺ کی دُعاؤں کا راز پہچانیں۔ اللہ تعالیٰ بندے کی دُعا قبول کرنا چاہتے ہیں اور درخواست ایسی ہے جو انہوں نے خود یا اُن کے رسول برحق ﷺ نے ہم کو Dictate کرادی ہیں۔ اس لئے ان دُعاؤں کی قبولیت میں ذرا بھر شبہ نہیں رہتا۔ ہر وہ دُعا جو بندے کے دل سے نکلتی ہے اور اُن الفاظ میں نکلتی ہے جو خدا اور رسول ﷺ نے اُسے سِکھائے ہیں مستجاب اور مقبول ہے، اس میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اس مقالے میں قرآنی دُعاؤں کا نہیں بلکہ حضور رسول مقبول ﷺ کی سِکھائی ہوئی دُعاؤں کا جائزہ لینا مقصود ہے تاکہ ان دُعاؤں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ سیرتِ رسول مقبول ﷺ کا وہ انسانی پہلو بھی اُجاگر ہوجائے جو سارے عالم انسانیت کے لئے مشعل طور اور چراغِ راہ کا کام دیتا ہے کہ ظاہر ہے کہ ایک مختصر سے مقالے میں اُن ساری دُعاؤں کا تجزیہ تو نہیں ہوسکتا جو حضور ﷺ نے فرمائی

ہیں۔ صرف چیدہ چیدہ دُعاؤں کا ذکر کیا جائے گا جس سے ایک طرف ہماری رہنمائی ہوگی، دوسری سیرت رسول ﷺ کا روشن ترین پہلو سامنے آئے گا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ ساری دُعائیں حضور ﷺ نے ہمیں سکھانے اور ہماری رہنمائی فرمانے کے لئے کی ہیں۔ خود حضور ﷺ اجابت اور قبولیت کا مجسمہ تھے اور آپ سے اللہ جل شانہٗ نے صاف لفظوں میں فرمایا تھا وَلَسوفَ یُعطِیکَ رَبُّکَ فَترضٰی بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو وہ سب کچھ عطا فرمائیں گے جس کو پاکر آپؐ راضی ہوجائیں۔ آپ کی شان میں خود عہد رسالت کے مایہ ناز نعت خوان حسان بن ثابت نے کہا تھا۔

خَلِقتَ مُنزّھاً مِن کُلّ عَیب　　　کانَکَ قَد خُلِقتَ کَمَا تَشاء

آپؐ کو تمام نقصوں اور عیبوں سے پاک پیدا کیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپؐ کو آپ کی منشاء کے مطابق پیدا کیا گیا ہے۔ آیئے اِس انسان کامل ﷺ کی چند دُعاؤں کا جائزہ لیں اور دیکھیں وہ اپنے لئے کیا چاہتے تھے اور وہ ہم کو کیا مانگنا سِکھا گئے ہیں۔

آپ اس دُنیا میں آکر کیسی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے تو آپ ضرور شش و پنج میں پڑیں گے۔ آیئے ہم آپ کو اس شش و پنج سے نکال دیں اور بتادیں کہ حضور ﷺ نے آپ کو کیسی زندگی گزارنے کی آرزو سکھائی ہے۔ فرمایا:

"الٰہی میں مانگتا ہوں ایک بے داغ اور پاکباز،
صاف ستھری زندگی، ہموار موت اور اس دُنیا سے واپسی جس

میں نہ کوئی رسوائی ہو، نہ کوئی فضیحت، بے داغ اور پاکباز زندگی میں وہ سب باتیں آگئیں، جو انسان کو انسان بنانے والی ہیں۔ ایسی پاکباز زندگی جس میں جھوٹ، فریب، دغا، جعلسازی، قتل و غارت، لڑائی جھگڑا، بدکلامی، بدزبانی اور بداخلاقی نہ ہو۔ جس میں کسی کو اذیت رسانی کا پہلو شامل نہ ہو۔ جس میں ہر وقت یہ تصوّر رہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اسے میرا مالک دیکھ رہا ہے اور مجھے اپنے ہر فعل اور عمل کے لئے ایک روز اس کے سامنے جواب دینا ہوگا اور پھر دُعا کی گئی کہ مجھے ہموار موت نصیب ہو، کسی حادثے کا شکار نہ ہو جاؤں، مرض الموت کی طوالت اور شدّت نہ ہو۔ موت سے پہلے اللہ جل شانہٗ کے وجود کا اعتقاد راسخ ہوجائے اور اِرْجِعِی اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیہ کی روشنی عطا ہو اور میرے اس دنیا سے جانے کے بعد لوگ مجھے اچھی طرح یاد کریں، میرے لئے مغفرت کی دعا کریں اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جس سے مرنے کے بعد میری فضیحت اور رسوائی ہو"۔

حضورﷺ کی ایک قدرے مفصّل دُعا کا ترجمہ سناتا ہوں۔

"الٰہی میری مغفرت فرما، میرے حال پر رحم کر، مجھے امن و امان میں رکھ، میرے رزق میں برکت دے، الٰہی میں

تیری پناہ مانگتا ہوں، کم ہمتی سے، سُستی اور کاہلی سے، بزدلی
اور بہت زیادہ بڑھاپے سے، قرضداری اور گناہگاری سے،
دوزخ اور قبر کے عذاب کے فتنے سے، مالداری اور افلاس کی
آزمائش سے، زندگی اور موت کے فتنوں سے، تیری پناہ مانگتا
ہوں سنگدلی اور غفلت سے، تنگدستی اور ذلت سے، خواری اور
کفر سے، بدکاری اور بداخلاقی سے، سننے اور دیکھنے کے فتنوں
سے، بہرے اور گونگے پن سے، دیوانگی اور کوڑھ کے مرض
سے، صبر آزما اور شدید بیماریوں سے، قرضے کے بوجھ سے، فکر،
تشویش، غم اور کنجوسی سے، لوگوں کی درازدستی سے، ایسے علم سے
جو نہ مجھے فائدہ پہنچائے نہ دوسروں کو، ایسے دل سے جس میں
خدا کا خوف نہ ہو، ایسے شکم سے جو کبھی سیر نہ ہو، اور ایسی دُعا
سے جو قبول نہ ہو"۔

یہ مفصّل دُعا ظاہر ہے کہ حضور رسالت مآب ﷺ کے حق میں بلاشبہ قبول ہوئی ہے۔ آپ کی زبان فیض ترجمان سے نکلی ہوئی یہ دُعا اگر ہم بھی کریں، تو کیا عجب کہ قبول ہو جائے اور اگر قبول ہو جائے تو اور کیا چاہئے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں کو اس کا تجربہ ہے کہ ایک آدمی ایک بستی میں رہتا ہے اور بدقسمتی سے اس کا ہمسایہ بُرا آدمی ہے، جھگڑالو ہے، بلاوجہ فساد برپا کرنے کا عادی ہے، آپ کے آرام و آسائش کو اپنے لئے عذاب سمجھتا ہے، ہم

جانتے ہیں کہ ایسی صورت میں زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ کوئی شخص چوری اور خیانت کا عادی ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنی اس بُری حرکت کو راز میں رکھتا ہے اور نہیں چاہتا کہ کوئی اور اس کی اس عادت سے واقف ہوجائے اور یہی راز میں رکھنے کی خواہش اس کیلئے وبال جان بن جاتی ہے اور ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ یہ چور اور خاین ہے۔ یہ بھی تجربہ ہے کہ زندگی کو اجیرن بنانے والی چیز بھوک کے برابر اور کوئی نہیں۔ قرار چھین لیتی ہے، نیند حرام کرتی ہے۔ بقولِ مولانا رومؒ آدمی سخت بھوک کی حالت میں کتابن جاتا ہے اور ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ان تین باتوں کو ذہن میں رکھ کر دعائے رسول ﷺ کا مفہوم پڑھئے۔

"الٰہی میں تیری پناہ مانگتاہوں، اپنی مستقل رہائش کی جگہ بُرے ہمسایہ سے، سفر کی حالت میں ایک دوروز کے لئے اگر بُراہمسایہ ملے بھی تو خیر، کیونکہ صبح ہوتے ہی وہ اپنی راہ لے گااور میں اپنی۔۔۔ اور تیری پناہ مانگتاہوں خیانت سے کیونکہ وہ بری ہمراز ہے اور کسی نہ کسی وقت بھانڈا پھوڑتی ہے، اور تیری پناہ مانگتاہوں بھوک سے، جو بہت بُری ہم خواب ہے"۔

خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے آرام دہ گھر ملے، نیک سیرت اور خداپرست بیوی ملے۔ مال و جائیداد حاصل ہو، اور انسان اولاد کی نعمت سے مالا مال ہو۔ غور سے دیکھیں تو متاعِ دُنیا یہی تین

چیزیں ہیں اور پھر ذرا سوچیں تو بعض دفعہ یہی تین چیزیں انسان کی زندگی کو وبال بنا دیتی ہیں۔ رسول مقبول ﷺ کی دُعا کا ترجمہ یوں ہے۔

"الٰہی میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایک ایسی عورت سے جو مجھے بوڑھا ہونے سے پہلے ہی بوڑھا بنا دے، پناہ مانگتا ہوں ایسی اولاد سے جو میرے لئے جان کا وبال بن جائے، پناہ مانگتا ہوں ایسی دولت سے اور ایسے مال سے جو میرے لئے عذاب جان بن جائے"۔

ہم سب نے دیکھا ہے کہ بعض بدقسمت لوگوں کو ایسی بدزبان، بدتمیز اور جنگجو عورتوں سے پالا پڑتا ہے جو اُن کو آرام و راحت پہنچانے کے بجائے اُن کے گلے کا طوق بن جاتی ہیں۔ اور اُن کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہیں۔ منّتوں اور دُعاؤں سے حاصل کی ہوئی اولاد بدراہ نکلتی ہے اور ماں باپ کے لئے عذابِ جان بن جاتی ہے۔ محنت سے حاصل کی ہوئی دولت اور مال ایسا عذاب بن جاتا ہے کہ انسان کی نیند اُڑ جاتی ہے اور وہ رات دن ننانوے کے پھیر میں زندگی کا سارا مزہ کھو بیٹھتا ہے۔ رسول مقبول ﷺ کی دور بین نگاہوں سے ایسی کوئی چیز چھُپ نہ سکی، جو انسان کی زندگی کو حرام کر دے اور اسی لئے آپ نے ہماری رہنمائی کے لئے ان مکروہات سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔

زندگی کے دن جیسے تیسے گزر جاتے ہیں۔ جوانی میں آفات کا سامنا ہو تو ان کا مقابلہ کرنے کی اُس میں ہمت بھی ہوتی ہے اور مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

افلاس ہو تو اس کا مقابلہ بھی کرتا ہے، رات دن محنت کر کے اس پر قابو پا لیتا ہے مگر ایک وقت آتا ہے کہ جب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور عناصر میں اعتدال نہیں رہتا۔ کسی مصیبت کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہتی۔ یہ بڑھاپا ہے اور عمر کا وہ مرحلہ جب اسے اطمینان اور فراغت نصیب ہونی چاہیئے۔ انہی باتوں پر نظر کرتے ہوئے میرے آقا مولیٰ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوبصورت اور جامع دُعا فرمائی ہے، ترجمہ یوں ہے:

> "الٰہی جب میرا بڑھاپا آجائے اور زندگی کے دن قریب آئیں، تو اس وقت میرے رزق میں بہت کشادگی دے اور مجھے افلاس میں مبتلا نہ کر، اور میری زندگی کا آخری حصہ میری زندگی کا بہترین حصہ ہو اور میرا بہترین عمل وہ ہو جس کا انجام بخیر ہو، میرا بہترین دن وہ ہو، جب مجھے آپ سے ملانے کے لئے واپس بلالیا جائے۔ ان جواہر پاروں پر مجھ ایسا نااہل اور کم سواد آدمی کیا اظہار رائے کرے۔ آپ سب دانا اور سمجھ دار ہیں ان ارشادات پر غور فرمائیے اور سوچیئے کہ ہمارے حضور نے ہماری زندگی کے کن کن گوشوں پر نظر ڈالی ہے اور ہمیں ہدایت فرمائی کہ اللہ جل شانہٗ سے گڑ گڑا کر دُعا مانگیں کہ وہ ہمیں مکروہاتِ دُنیا سے نجات دے کر حسنات کی راہ پر ڈال دے۔

حضورﷺ مکہ سے طائف تشریف لے جاتے ہیں تاکہ وہاں کے لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ طائف کے لوگ بڑی بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔ اُن پر پتھر برساتے ہیں اور آپﷺ لہولہان ہوجاتے ہیں۔ اس حال میں بھی آپؐ اُن کے لئے کوئی بد دُعا نہیں کرتے بلکہ اللہ جل شانہٗ کے حضور اپنی بپتا بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ دُعا اظہارِ عبودیت اور تفویض الی اللہ کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ اسکے آخری حصے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

''یا اللہ تجھی سے شکوہ کرتا ہوں اپنے ضعیف القوۃ ہونے کا، اپنی بے سروسامانی کا اور لوگوں کی نظروں میں اپنی کم وقعتی کا، اے ارحم الراحمین! تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کیا کسی دشمن کے، جو مجھ پر سینہ زوری کرے یا تو مجھے کسی عزیز کے قبضے میں دینا چاہتا ہے جو میرے سیاہ و سفید کا مالک ہے، بہرحال اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے اس کی ذرّہ بھر پروا نہیں، اسلئے کہ تیرے امن کی دُنیا میں میرے لئے بہت زیادہ گنجائش ہے''۔

یہ اس دُعا کا آخری حصہ ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورﷺ سخت قسم کی آزمائش میں بھی کس قدر صابر اور متوکل علی اللہ تھے اور ہمیں کیسی تعلیم دے گئے۔ ایک اور دُعا کا ترجمہ!

''الٰہی مجھے تکلیف اور رنج میں صابر، راحت و

آسائش میں شکر گزار بندہ بنادے، مجھے میری نظروں میں حقیر
اور اوروں کی نظروں میں عظیم بنادے''۔

اب ایک اور جامع الکلم دُعا کا مفہوم:

''الٰہی میری خبر گیری اور نگہبانی اسی طرح سے کر جس
طرح ایک نوزائیدہ بچے کی کی جاتی ہے''۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس دُعا کو طبِ نبویؐ کا ایک لاجواب نسخہ قرار دیا ہے۔

''الٰہی مجھے اپنے فیصلے پر راضی برضا رکھ اور جو کچھ
تو نے میرے لئے مقدر کیا ہے، اس میں برکت دے، یہاں
تک کہ جس چیز میں تو نے درنگی کی ہے، اس میں تعجیل نہ
چاہوں اور جس معاملے میں تو نے تعجیل سے کام لیا ہے، اس
میں درنگی کا طالب نہ ہوں''۔

یہ ہے وہ ذات والا صفات، سرور کائنات فخر موجودات محمد عربی ﷺ جس کا رتبہ ثُمَّ دَنَیٰ فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوسَینَ اَوَ اَدنیٰ ہے، جو ان بلندیوں سے بھی اللہ کی سرزمین پر رہنے والی مخلوق کو بھلا نہ سکے اور ان کے رشد و ہدایت کے لئے اپنی دُعاؤں کی صورت میں ایک ایسا خزانہ چھوڑ گئے، جس کی چمک دمک سے دلوں کی ظلمتیں دور ہوجاتی ہیں۔ نور کے فوارے پھوٹتے ہیں اور سارا ماحول جگمگا اٹھتا ہے۔

☆☆☆

قرآن مجید اور نعتِ رسولؐ

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کبریتِ احمر کی صورت میں رشدوہدایت کا ایک بیش بہا نسخہ ترتیب دیا ہے۔ یہ کتابچہ بیک وقت مناجات، نعت، درود اور دعا کا ایک لاجواب امتزاج ہے۔ حضورؐ کے مراتب بیان کرتے وقت ایک جگہ اللہ جل شانہٗ کی اس عنایت کا ذکر ہے جس سے اس نے حضور رسالت مآب ﷺ کو فیض یاب کیا ہے۔ فرمایا المتخلق باعلیٰ رتبۃ العبودیۃ یعنی حضورؐ پرنور کو اللہ تعالیٰ نے عبودیت اور بندگی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا ہے۔ اس محفل میں اور باتوں کے علاوہ تھوڑی دیر اس کا جائزہ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون، ہم نے جن و انسان کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ یعنی جن و انسان کی تخلیق کا مقصد ہی عبادت الٰہی ہے۔ اب اس عبادت الٰہی کے طور طریقے مختلف ہیں۔

قرآن و حدیث میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے کہ حقیقی عبادت کیا ہے اور اس کا ماحصل یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو اپنے قول، فعل اور سوچ میں محتاط رہنا ہوگا اور ہر قول و فعل اور سوچ سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ کہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا امکان تو نہیں۔ اللہ سمیع و بصیر ہے۔ وہ ہمارے ہر کام سے واقف ہے، وہ ہمارے دلوں کا حال جانتا ہے اور اس سے ہمارا کوئی فعل پوشیدہ نہیں۔ اس لئے ہر قول اور ہر فعل اور ہر ارادے کو اللہ کی مرضی کے تابع بنانا ہوگا۔ اور یہ اعتقاد راسخ کرنا ہوگا کہ ایک دن مجھے اپنے قول و عمل اور نیت کے بارے میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔ یہی عبادت کا ماحصل ہے اور جہاں تک عبادت کا تعلق ہے وہ ہم پر اس کا ایک حق ہے۔ جو ہماری بشری کمزوریوں کی وجہ سے ہم سے پورا نہیں ہوسکتا۔ یہ حق اگر پورا کیا جائے تو اس ذات مولیٰ صفات نے جو خدا کے رسول ہونے سے پہلے خدا کے بندے ہیں۔ محمداً عبدہٗ و رسولہٗ۔ رسالت اسی صورت میں مل سکتی ہے جب عبودیت کا حق پورا پورا ادا ہو جائے۔ یہ حق صرف انہوں نے پورا کیا اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی کسی پیغمبر کا ذکر آیا ہے تو اس کے نام کے ساتھ عبدنا بھی ہے۔ مثلاً عبدنا ایوب، عبدنا ذکریا وغیرہ لیکن جہاں حضور رسالت مآب سید العابدین محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہے وہاں صرف عبدنا ہے نام نہیں، یعنی محمدؐ عبدِ خالص ہیں اور جس طرح اللہ تعالیٰ معبود مطلق ہے اسی طرح محمدؐ عبدِ مطلق ہیں۔ ہم سب اللہ کے بندے ہیں۔ ان میں انبیا، اولیاء، اصفیا، اتقیا، علماء و صلحا سب شامل ہیں۔ مگر

خاص بندہ عبد مطلق محمدؐ رسول اللہ ہیں اور اسی لئے قرآن مجید میں جہاں جہاں حضورؐ کا ذکر آیا ہے وہاں خالص لفظ عبد استعمال فرمایا گیا ہے۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ. سبحان الذی انزل علیٰ عبدہٖ الکتاب واوحیٰ الیٰ عبدہٖ مااوحی ۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہاں صرف عبد کا استعمال ہوا ہے۔ عبدنا محمد نہیں فرمایا گیا۔ اس لئے کہ وہ اس طرح عبد مطلق ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ معبود مطلق ہیں اور اسی کے معنی ہیں کہ عبدیت خالص کا حق اگر کسی نے ادا کیا ہے تو وہ محمدؐ ہیں اور یہی وہ بندگی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے:

''مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی''

اور اسی عبدیت خالص کا یہ انعام ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دُنیا کے لوگوں کے سامنے نت نئے اوصاف کے ساتھ متعارف فرماتے ہیں۔ یا ایھاالنبی انا ارسلناکَ شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنہٖ و سراجاً منیرا۔

''اے نبیؐ ہم نے آپ کو لوگوں کی طرف شاہد، بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اللہ کے حکم سے ان کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں''۔ ایسے روشن چراغ جو کہ کفر کی ظلمتوں اور جہالت کے اندھیروں کو ہدایت کے اجالوں میں بدل دیتے ہیں۔ جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلا کر اس کے احکام کی تعمیل کرنے کی ہدایت کر کے ان کو آنیوالی زندگی میں جنت اور مغفرت کی بشارت دیتے ہیں۔ جو غلط راہ پر چل کر عالمِ انسانیت کو گمراہی کے غار میں دھکیل

دیتے ہیں انہیں خبردار کرتے ہیں کہ تم اپنے ان اعمال کی پاداش میں دوزخ کا ایندھن بن جاؤ گے، ان حرکتوں سے باز آؤ اور ڈرو اِس سے جو وقت ہے آنے والا۔

قرآنِ مجید اسی عبدِ مطلق کی تعریف و توصیف سے بھرا پڑا ہے۔ اس مختصر سی مجلس میں صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا:

لقد جاء کم رسولٌ من انفسکم عزیزٌ علیه ما عنتم حریص علیکم و بالمومنین رؤف رحیمْ

''بے شک تمہاری طرف تم ہی میں سے ایک رسول آیا ہے جب تم کو تکلیف میں دیکھتا ہے تو کڑھتا ہے اور وہ تمہارا دلدادہ ہے اور تمام مومنین کیلئے رحمت و راحت کا پیکر بن کا آیا ہے''۔ اور یہ عبدِ مطلق اپنے معبودِ مطلق کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنے اوپر راتوں کا آرام حرام کرتا اور غارِ حرا میں خلوت گزیں ہو کر اپنے محبوب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف ہو جاتا ہے۔ تو ریاضت کی کثرت کی وجہ سے آپؐ کے پائے مبارک میں ورم ہوتا ہے اور آپؐ کی صحت بگڑنے لگتی ہے۔ صاحب قصیدۂ بردہ نے فرمایا:

ظلمت سنته من احیٰ الظلام الیٰ اَن اشتکت قلماہ الضر من ورمه

راتوں کو بیدار رہ کر حضورؐ کی صحت پر اثر پڑنے لگا تو آپؐ کے پائے متورم ہو گئے تو محبوب یعنی معبودِ مطلق کو اپنے حبیب یعنی عبدِ مطلق کی طرف سے فکر ہوئی اور ارشاد ہوا کہ اتنی ریاضت شاقہ نہ فرمایئے۔

یا ایھاالمزمل قم اللیل الا قلیلا، نصفهٔ او انقص منهٔ قلیلاً.

''اے کالی کملی اوڑھنے والا ساری رات جاگا نہ کر۔ تھوڑے سے حصے میں جاگتے رہ۔ آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم یا کچھ زیادہ۔ ساری رات نہیں''۔ فرمایئے اتنی ناز برداری کی مثال آپ کو اور کہاں ملے گی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں، جب سجدے کے احکام نازل ہوئے، تو کئی مرتبہ حضورؐ اتنے طویل سجدے کرتے کہ میرے دل میں وسوسے اور اندیشے پیدا ہوجاتے۔ میں ان کو حرکت دیتی۔ وہ سجدے سے سرِ مبارک اٹھاتے تو وہ آفتاب عالمتاب کی طرح درخشاں نظر آتے۔ میں کہتی یا رسول اللہ کیا آپ کو بشارت نہیں دی گئی ہے۔

لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذمبک وما تاخر. ویتم نعمتُ علیک و یھدیک صراط مستقیما......

''اللہ آپ کی گزشتہ اور آنے والی لغزشوں کو معاف فرماتا ہے۔ اپنی نعمتیں آپ پر پوری فرماتا ہے۔ آپ کو سیدھی راہ دکھاتا ہے اور آپ کو دشمنوں پر فتحِ مبین عطا فرماتا ہے''۔ تو پھر آپ کو اتنے طویل سجدے دینے کی کیا ضرورت ہے۔ تو حضورؐ فرماتے عائشہؓ کیا تو نہیں چاہتی کہ میں خدا کا شکرگذار بندہ بنوں۔ کیا میں اپنے محبوب کی توجہات اور عنایات کو بھول جاؤں۔ کیا مجھے عبداً مشکورا نہیں کہا گیا ہے۔ آقا اپنے غلام سے خوش ہوتا ہے تو اشارات وکنایات میں اپنی مسرّت اور اطمینان کا اظہار کرکے غلام کی حوصلہ افزائی کرتا ہے مگر اس مالک اور

اس بندے کی بات ہی دوسری ہے۔ یہاں مالک اور بندہ میں محبوب اور حبیب کا رشتہ بھی ہے۔ اس لئے اشارات و کنایات سے کام نہیں لیا جاتا۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے واضح الفاظ اور صراحاً فرمایا جاتا ہے اور اعلان کیا جاتا ہے وما ارسلنکَ اِلا رحمةً للعالمین۔

''ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر عالمین کیلئے رحمت بنا کر''۔ عالم ایک ہی نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ عالموں کی تعداد کیا ہے۔ کائنات کی حدودِ اربعہ کیا ہے۔ اس کی وسعتوں کا عالم کیا ہے اور ان تمام پنہائیوں اور وسعتوں کیلئے اگر پیغام رحمت لے کر کوئی آیا ہے تو وہ رسالت پناہ شفاعت دستگاہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکت ہے۔ یہ وہ بندۂ مولیٰ صفات ہے جس کی بارگاہ میں جنید و بایزید ہی دم سادھ کر نہیں آتے بلکہ ان کے مقامِ بلند کو دیکھنے کیلئے بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبروں کو بھی اپنی پگڑیاں سنبھالنی پڑتی ہیں۔ ذرا غور فرمایئے لوگوں کو ابھی مقامِ رسالت سے کما حقہٗ آگاہی نہیں۔ انہیں حضورؐ سے ملنا ہوتا ہے تو آ کر گھر کے باہر پکارنے لگتے ہیں، تو خالق کائنات کی طرف سے تہدید اور تنبیہ ہوتی ہے۔

اِن الذین ینا دونک من وراء الھجرات اکثر ھم لا یعقلون، ولو انھم صبرو حتیٰ تخرجھم لکان خیر لھم واللہ غفور الرحیم.

''جو لوگ آپ کو آپ کے گھر کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر نادان اور بے وقوف ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت تک صبر کرتے جب تک آپؐ خود اپنے گھر سے باہر تشریف نہ لاتے تو وہ ان کیلئے باعثِ خیر ہوتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے"۔ حضورؐ کی محفلِ مبارک میں یہی لوگ کبھی کبھی زور زور سے بولنے لگتے ہیں اور انہیں اندازہ نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور کس محفل میں ہیں، تو ارشاد ہوتا ہے۔

یا ایھاالذین آمنو لا ترفعوا صواتکم فوق صوۃ النبی ولا تجھرو لہٗ باالقول کجھر بعضکم بعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون.

"اے ایمان والو! اپنی آواز رسولؐ کی آواز سے اونچی نہ رکھو اور ان کے ساتھ اس طرح بڑھ چڑھ کر نہ بولا کرو جس طرح تم آپس میں چیخ چیخ کر بولتے ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں یہ سوءِ ادب ہے اور اس سے تمہارے اعمال غارت ہوجائیں گے اور تم کو خبر تک نہیں ہوگی"۔ سبحان اللہ تعالیٰ العظیم۔ خالقِ کائنات کو یہ منظور نہیں کہ کوئی حضورؐ کے سامنے اپنی اونچی آواز میں بولے اور خبردار کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کے تمام اعمال غارت ہوجائیں گے۔ ضابطہ اخلاق کا یہ عظیم الشان منشور جو ربِ کائنات نے عطا فرمایا ہے۔ اس بات کی شہادت ہے کہ حضورِ پُرنورؐ کی ذاتِ بابرکات کے متعلق معمولی سی کوتاہی بھی خالق کائنات کو منظور نہیں اور اسے ایسا گستاخانہ عمل قرار دیتا ہے جس کی سزا تمام اعمال کی غارت گری ہے۔ وقت ایک لامتناہی اور غیر منقسم اکائی ہے۔ مگر ہمارے کرۂ ارض کا وقت نظامِ شمسی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے رات دن میں بٹ گیا ہے اور پھر سسٹم ایسا ہے کہ اسی کرۂ ارض پہ کہیں دن ہوتا ہے اور اسی وقت کہیں رات ہوتی ہے۔

ہر ملک کے ہر حصے میں وقت میں تفاوت ہے۔ اگر یہاں شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں تو انگلستان میں دن کے تین بجے ہوں گے۔ اسی اعتبار سے کرۂ ارض کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں کسی نہ کسی وقت نماز کا وقت نہ ہو۔ گویا دن رات کے چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہیں جب ربِ کعبہ کے پرستار رکوع و سجود میں مصروف نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ ہر نماز سے پہلے اذان ہوگی۔ اور اذان میں اشہد ان لاالہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ اشہد ان محمدؐ رّسول اللہ کا اعلان بھی ہوگا اور ہر لمحہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ پر بلند میناروں سے یہ آواز گونجتی رہے گی۔ فرمایئے ورفعنا لک ذِکرک کی اس سے بہتر تفسیر ممکن ہے کہ ہم نے آپؐ کے ذکر اور آپؐ کی یاد کو ارفع و اعلیٰ بنا دیا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹے کے ہر سیکنڈ میں دُنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اشہد اَن محمدؐ رّسول اللہ کی گونج اور پکار ہوگی۔ رسولِ مقبول ﷺ کی نعت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ خالق و مخلوق، عبد و معبود و حبیب و محبوب کا یہ عظیم الشان امتزاج قرآنِ مجید کی تقریباً تمام آیات سے ظاہر ہوگا۔ اس کیلئے علمِ قرآن میں تدبر کی ضرورت ہے۔ ہم ایسے کم سُواد اور بے علم کیا جانیں، چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کر کے خریدارانِ یوسف میں اپنا نام شامل کرنے کی جسارت ہے۔ پھر اس بات کا خیال رکھیۓ کہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں لعلِ بدخشان ہوگا تو وہ لعل بدخشان ہی ہوگا۔ کوڑے کرکٹ کو نظر انداز کر کے لعلِ بدخشان کو اٹھایا اور سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ سچی اور معرفت کی بات کم سواد بھی بتائے تو اس کو گرہ میں باندھیئے۔ عربی کا مقولہ ہے!

انظر الیٰ ماقال ولا تنظر الیٰ من قال

یہ دیکھو کہ کیا کہا جارہا ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے۔ محبّ اور حبیب کا راز و نیاز محبّ اور حبیب کے سوا اور کون جانتا ہے۔ منوّر لکھنوی نے بجا فرمایا!

وہ خدا نہیں بخدا نہیں وہ مگر خدا سے جدا نہیں
وہ ہے کیا مگر وہ ہے کیا نہیں یہ محبِ حبیب کی بات ہے

لا الـلـه الا الله کے ساتھ جب تک مـحـمد رسول الله ﷺ نہ ہو کلمہ طیبہ مکمل نہیں۔ اللہ کے فضل کے ساتھ جب تک رسول کا فضل بھی شامل نہ ہو وہ مکمل نہیں۔ اس پر قرآن مجید کے سورۃ التوبہ کی یہ آیت کریمہ گواہ ہے۔

ولو انهم رضوا ما آتاهم الله و رسولهٗ و قالو حسبنا الله سيوتينا الله من فضلهٖ و رسولهٗ انا لیٰ الله راغبون.

اور وہ جو اس پر راضی ہوگئے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے عطا کیا اور بولے اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ بے شک اللہ ہم کو اپنے فضل اور اس کے رسول کے فضل سے نوازے گا۔ اور بے شک ہم اللہ کی طرف راغب ہونے والے ہیں۔

خدا کا فضل اور اسکے رسول کا فضل ساتھ ساتھ ہونا چاہئے اور جس طرح اللہ کی اطاعت اس وقت تک کافی نہیں جب تک اس میں اطاعت رسول بھی شامل نہ ہو۔

من يطع الرسول فقد اطاع الله

بلکہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ خاص کے طفیل ہم سب کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین!

(۷راگست ۱۹۹۵۔ تقریر بتقریب عید میلادالنبیؐ۔ ٹیلی ویژن سری نگر)

☆☆☆

اسلام میں تصّورِ جمال

اسلام کے ساتھ ہی بانئ اسلام کا تصّور آنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اسلام کے تصّور کا خالق اگرچہ خالقِ کائنات ہے لیکن حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دنیا میں عام کرنے کا ذریعہ بن گئے۔ حضورؐ کو اس معنی میں بانئ اِسلام کہنا دُرست نہیں بلکہ پیغمبرِ اِسلام کہنا زیادہ صحیح ہے۔ لیکن حضورؐ کے نامِ مبارک کے ساتھ یہ اصطلاح بھی چل پڑی ہے۔ اس لئے اسے استعمال کرنے میں حرج بھی نہیں۔ جب ہم اسلام کے کسی پیغام یا کسی پہلو پر نقد و نظر کریں گے تو ظاہر ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ بابرکات ضرور سامنے آئے گی۔ اسلام میں تصّورِ جمال کا تفصیلی جائزہ لینے سے پیشتر اس لئے ہمیں خود پیغمبرِ اسلامؐ کے جمال و تصّورِ جمال کو سمجھنا ہو گا۔

تاریخ اس بات پر متفق الرائے ہے کہ حضور علیہ لصلوٰۃ والسلام مردانہ حُسن کا کامل نمونہ تھے۔ بے داغ، بے عیب اور ماہِ کامل کی طرح بے کم و کاست۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ ایک روز چاندنی رات میں حضورؐ سُرخ رنگ کا حلہ پہنے بیٹھے تھے۔ ہم ایک نظران کو، ایک نظر چاند کو دیکھتے تھے۔ مگر خُدا کی قسم حضورؐ چاند سے زیادہ حسین، دل فریب اور خوب صورت تھے۔ "واللہ ما رأینا مثلہ قبلہ ولا بعدہ"۔ آپ ہی کا فرمان ہے۔ حضور کی چہیتی بیوی اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ایک شام کوئی کپڑا سی رہی تھیں۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ سوئی ہاتھ سے گرِی۔ اتنے میں حضورؐ تشریف لائے۔ آپکے جمالِ جہاں آرا سے سُوئی چمک اُٹھی۔ حضرت عائشہؓ بداہتاً بول اٹھیں......

"لوامی زلیخا لو رأین جبینہ   لآثرن بالقطع القلوب علی الأیدی"

حضرت یوسفؑ کی عاشق زار زلیخا کا عشق بدنام ہوا۔ تو مصر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب نے زلیخا کو ملامت کی کہ وہ ایک زرخرید غلام کی زُلفِ گرہ گیر میں اسیر ہو گئی ہے۔ زلیخا نے ان سب کو کھانے پر بُلایا۔ کھانے کے بعد اُنکے سامنے پھل رکھے گئے اور ان کو کاٹنے کیلئے چُھریاں موجود تھیں۔ جب ان خواتین نے چھُریاں ہاتھ میں لیں تو یوسفؑ اُن کے سامنے آ گئے۔ ان کے ہوش اُڑ گئے اور وہ پھل کاٹنے کے بجائے اپنے ہاتھ کاٹنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، کاش وہ میرے اس یوسفؑ کو دیکھتیں۔ تب انھوں نے ہاتھ کاٹے تھے، اب اپنے دل کاٹ دیتیں۔ حضورؐ کے جمال کی تکمیل اُن عادات

داوصاف سے ہوئی جو اللہ کی طرف سے اُنکو عطا ہوئے تھے۔ وہ باحیا دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے، قادرالکلام شاعروں اور ادیبوں سے زیادہ خوش گفتار، بادصبا سے زیادہ خوش رفتار اور عادات و اطوار کے اعتبار سے دِل پذیر تھے۔ مکّہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو مدینے کی لڑکیاں اُن کے لئے استقبالیہ گیت گا رہی تھیں۔

"أشرق البدر علینا من ثنیات الوداع"

رخصت کی پہاڑیوں کے پیچھے سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔ ظاہر ہے کہ جس انسان کو اللہ کی قدرتِ کاملہ نے اپنے بے پایاں حُسن کی دولت سے اس حد تک مالامال کر دیا ہو، اس کی اپنی حُسن پسندی اور جمال نوازی کیا ہو گی۔ ایک روایت سے یہ حدیث ہے "اللہ جمیلٌ ویحبُ الجمال"۔ اسکا مفہوم ہے کہ خدا حسین ہے اور وہ حُسن کو دوست رکھتا اور پسند کرتا ہے۔ مجھے حدیثوں کی جرح و تعدیل کا علم نہیں۔ لیکن یہ عام اصول میرے سامنے ہے کہ جو حدیث حضورؐ کی طرف منسوب کی گئی ہے اگر وہ قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق ہے اور راوی بھی ثقہ ہے تو وہ سچی حدیث ہے۔ اس عام اصول کے پیش نظر مجھے ذاتی طور پر "اللہ جمیلٌ ویحبُ الجمال" بالکل صحیح حدیث نظر آتی ہے۔ اوّل اس لئے کہ یہ حدیث اس نبیؐ کی طرف منسوب ہے جو خود حُسن و جمال کا بے نظیر نمونہ ہے اور جس نے حُسن کی ہمیشہ قدر فرمائی۔ "اللہ جمیلٌ ویحبُ الجمال" چار لفظوں کا جُملہ ہے اور نہ صرف اپنی ترکیب سے خود حُسن و جمال کا مُرقع ہے بلکہ معنوی اعتبار سے انسان کیلئے ایک روشن کتاب اور شمع مبین سے زیادہ ہے۔ اللہ جل شانہ، کے

جمیل ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ کشمیر کے پہاڑ جھیلیں، باغات اور وادیاں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا بنانے والا جمیل نہیں ہوگا۔ اقبال نے فرمایا:

کوہ ہائے جنگ سارِ اونگر　　آتشیں دست چنارِ اونگر

لکہ ہائے ابردر کوہ و دَمن　　پنبہ پَرّاں از کمانِ پنبہ زن

کوہ و دریا و غروبِ آفتاب　　من خُدارا دیدم آنجا بے حجاب

ہم کشمیر میں رہتے ہیں، اس لئے ہم کشمیر کے حُسن و جمال کے شیدائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی کائنات ہے وہ کتنی حسین ہوگی، شاید اس ساری کائنات میں جس کا کہیں اندازہ بھی نہیں کروڑوں مقامات اور کروڑوں مناظر ایسے ہوں گے جن کے سامنے کشمیر کی شادابی ہیچ ہوگی۔ اس سارے حُسن و جمال کے خالق کے اپنے حُسن کا اندازہ کون کر سکتا ہے اور اس کے جمالِ جہاں آرا کا معمولی سا اندازہ بھی کسے ہوسکتا ہے۔ اللہ جمیل' میں کوئی کلام نہیں۔ اللہ بے شک جمیل ہے، اس کو دوبدو کسی نے نہیں دیکھا، لیکن اُس کی صنعت گری کو دیکھ کر ہر دِل اقرار کرتا ہے کہ وہ جمیل ہے، جس کا نقش اتنا حسین اور دلفریب ہے۔ وہ خود کیا ہوگا، بدصورت آرٹسٹ حسین آرٹ کی تخلیق نہیں کرسکتا، بُرا آدمی اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔ کمینہ فطرت کا انسان اعلیٰ قسم کا کہانی کار نہیں ہوسکتا۔ اچھا آدمی اچھی تخلیق کرے گا۔ اچھے اور حسین خدا نے اچھی اور حسین تخلیق کی جو پہاڑوں اور دریاؤں کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، چشموں اور گھاٹیوں کی شکل میں ظہور پزیر ہوئی۔ طلوعِ قمر اور غروبِ شمس کے روپ میں نظر نواز ہوئی۔ اس دنیا کا حال یہ

ہے کہ جہاں نظر پڑتی ہے وہاں حُسن کی کارفرمائی ہے۔

زِ فرق تابقدم ہر کُجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جاایں جاست

شرط اس کے لئے یہ ہے کہ انسان میں شرافت زیادہ ہو۔ وہ رب المشرق و المغرب کی تخلیقات میں حُسن کی تلاش کرے۔ بری چیزوں کی تلاش میں اپنی شرافت انسانی کو محلِ نظر نہ بنائے۔ لطیفہ یہ ہے کہ جانسن نے جب اپنی ضخیم ڈکشنری تیار کی تو اُن کے پاس ایک عورت آئی اور بولی...... "ڈِکشنری تو آپ نے بڑی عظیم بنا لی ہے، لیکن اس میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ آپ نے اس میں فحش الفاظ کثرت سے جمع کئے ہیں"۔ جانسن نے جواب دیا۔ "محترمہ! اس میں میرا قصور نہیں۔ آپ نے تلاش ہی وہ لفظ کئے ہیں جو فحش ہیں"۔ اس قسم کی سپرٹ ہو تو حسین چیز بھی بدصورت نظر آئے گی۔ نفسِ انسانی میں شرافت کا عنصر غالب ہو، تو ہر چیز میں حُسن نظر آئے گا۔

برگِ درختانِ سبز درنظر ہوشیار
ہر ورقے دفترے است معرفتِ کردگار

اللہ جمیل' کے اصول کو ذہن نشین کرنے کے بعد اس حدیث کا دوسرا ٹکڑا "ویحبُّ الجمال" خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ خدا جمال پسند نہ ہوتا تو حسین وجمیل چیزوں کی تخلیق ہی کیوں کرتا؟ ظاہر ہے کہ اس قدر جمال پسندی کے بعد اُس کا محبوب بندہ وہی بن سکتا ہے جو خود حسین ہو۔ حسین کا لفظ میں وسیع معنوں

میں استعمال کر رہا ہوں۔ جس انسان کو اللہ نے اخلاق حسنہ کے زیور سے آراستہ کیا ہے وہ بھی حسین ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ "انك لعلى خلق عظيم"۔ آپ کے اخلاق بے شک بہت بڑے ہیں۔ جس کو اللہ نے علم و فضل کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہ بھی حسین ہے کیونکہ علم بھی حُسن ہے۔ جس کو خدائے بُزرگ وبرتر نے نوعِ انسانی کی ہمدردی اور دوستی کے جذبات سے سرفراز فرمایا ہے، وہ بھی حسین ہے۔ جس انسان کو خدا نے قبول عام بخشا ہے، وہ بھی حسین ہے۔ جس کو وطن اور ملک کی خدمت کی توفیق ارزانی ہوتی ہے وہ بھی حسین ہے، اور ظاہر ہے کہ خدا ان سارے حسینوں کو دوست رکھتا ہے، قرآن اسلام کی بنیاد ہے اورظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم کے ارشادات ہی سب سے زیادہ موثق اور قابل اعتبار ہیں آیئے اس بحرِ بے کنار سے ہم اپنی محدود استعداد کے مطابق چند قطرے نِکال کر آپ کو دکھا دیں کہ قرآن کے فرمودات کے مطابق حُسن و جمال کا تصّور کیا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے......

"قولوا قولا حسنا"

لوگو! جب لوگوں سے بات کرو تو دِل لُبھانے والی بات کرو۔ حُسن و جمال سے بولو، سلیقے سے بولو۔ میں ذاتی طور پر اس تین لفظ کی آیت سے اس قدر متاثر ہوں کہ اس پر بڑے سے بڑا لٹریچر قربان کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی شیرینی کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ بھی نہیں ہوسکتا۔ صرف اسے حُسنِ مذاق سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

پھر فرمایا:

"الذین یذکرون اللّٰہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم یتفکّرون

فی خلق السموت والأرض ربّنا ماخلقت ھذا باطلا"

(وہ لوگ جو اللہ کو اُٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے یاد کرتے ہیں، اس زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تم نے جو کچھ پیدا کیا، وہ بے معنی اور باطل نہیں۔)

زمین و آسمان کی پیدائش پر غور کرنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے جمالیاتی اور افادی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے۔ جب انسان پورے خلوص اور شوق سے ایسا کرے گا تو اسے دُنیا کی ہر شے حسین نظر آئے گی۔ وہ اسے شکست خوردہ ذہنیت کے بجائے پُر امید نگاہوں سے دیکھنے لگے گا۔ اسے دنیا و مافیہا کا حُسن لازوال نظر آئے گا۔ اور یہی حُسن شناسی اُسے نقش سے نقاش کیطرف رہنمائی کرے گی اور وہ بے اختیار ہو کر پکار اُٹھے گا کہ تو نے یہ سب کچھ بلاوجہ پیدا نہیں کیا۔ یہ سب کچھ حسین چیز ہے اور حسین چیز بے معنی، ناکارہ، رائیگاں اور باطل نہیں ہوتی۔ اسکا بدیہی اور لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا دل صناعِ ازل کی یاد سے ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہ رہے گا۔

اور پھر فرمایا:

"قل أریتم ان جعل لکم اللیل سرمدا الی یوم القیمة من اله غیر الله یأتیکم بضیاء أفلا تسمعون۔ قل أریتم ان جعل علیکم النھار سرمدا الی یوم

القیامۃمن الہ غیر اللّٰہ یأ تیکم باللیل تسکنون فیہ أفلا تبصرون"
(آپ کہیے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالےٰ تم پر ہمیشہ کیلئے قیامت تک رات ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آوے تو کیا تم نہیں سُنتے؟ آپ کہیے بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالےٰ تم پر ہمیشہ کیلئے قیامت تک دِن ہی دِن رہنے دے۔ تو خدا کے سوا کون وہ معبود ہے جو تمہارے لئے رات لے آئے، جس میں تم سکون پاؤ۔ کیا تم دیکھتے نہیں؟)

ذرا سا غور فرمایئے۔ تو حُسن و جمال کا صحیح اور بنیادی فلسفہ اس آیت کریمہ کو سمجھنے سے آئینے کی طرح صاف ہو جائے گا۔ ارشاد ہوا کہ اگر تمہاری زندگی میں رات ہی رات ہوتی تو تم روشنی کو پا لینے کے لئے کتنے پریشان ہو جاتے، دِن ہی دِن ہوتا تو تم رات کے نظر نواز حُسن اور سکون کیلئے کیا کرتے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس آیت میں حُسن و جمال کا بنیادی فلسفہ بیان فرمایا گیا ہے۔ حُسن کے لئے تنوع ضروری ہے۔ یکسانیت اور یک رنگی میں حُسن نہیں ہوتا۔ اگر ایک باغ میں ایک ہی رنگ کے پھول ہوں گے تو وہ پھول خار کی طرح کھٹک جائیں گے۔ اگر ساری زمین کفِ دست اور ہموار ہو تو زندگی ناہموار ہو جائے۔ اسی لئے حسین و جمیل خدا نے کہیں خوبصورت وادیاں بنا دیں تو کہیں سر بفلک پہاڑ کھڑے کیئے۔

"أفلا ینظرون الی الابل کیف خلقت و الی السماء کیف رفعت
والی الجبال کیف نصبت و الی الأرض کیف سطحت"

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا۔ آسمان کو کیسے اونچا کر دیا گیا۔ پہاڑ کس طرح نصب کر دیے گئے اور زمین کس طرح ہموار بنا دی گئی۔

یہی رنگا رنگی اور بوقلمونی حسن کی جان اور جمال کی اساس ہے۔ اقبال کے الفاظ میں حُسن کی تصویر میں تغیّر کا رنگ بھر دیا گیا ہے۔ یہ تغیّر نہ ہو تو حُسن بھی نہ ہو۔ اسی تصور کو سادہ اور بلیغ الفاظ میں اللہ تعالے فرماتے ہیں کہ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ اگر قیامت تک ایک مسلسل دن ہوتا تو تمہاری زندگی اجیرن ہو جاتی۔ یا قیامت تک ایک لگاتار رات ہوتی تو تم ایک لمحہ زندہ رہنا پسند نہ کرتے۔ وہ اکتاہٹ ہوتی جو جان لیوا ثابت ہوتی۔ اب صورت یہ ہے کہ دِن کا جمالِ جہاں آرا زندگی کا پیغام دیتا ہے اور آدمی تازہ دم ہو کر کارزارِ حیات میں جُت جاتا ہے۔ شام تک اس کش مکش میں تھک جاتا ہے تو رات سکون اور اطمینان کا پیام لاتی ہے، محرمِ راز بن کر انسان کی محرومی کو دور کرتی ہے۔ غریب ہو یا امیر، بڑا ہو یا چھوٹا، اسی طلسمِ دوش و فردا اور حیرت خانۂ شب و روز میں اسیر ہے اور اسی تغیّر کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر جمال کا تصور کوئی اور ہوسکتا ہے۔ کیا اس سے بہتر حُسن کی عکاسی کسی اور طرح سے ہو سکتی ہے؟ یہی تغیّر ہے جو جمال کو جنم دیتا ہے۔ نشیب و فراز کی پیچیدگیوں سے حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ خیر و شر کی کشمکش میں جمال پروان چڑھتا ہے حق و باطل کی آویزش میں خوبصورتی کی دیوی جلوہ افروز ہو کر نکلتی ہے۔ نیک و بد کی چپقلش میں حسن پرورش پاتا ہے اور خدائے جمیل کی حسین تخلیق یعنی انسان اس جمالِ لازوال سے ازل

سے مستفید ہوتا آیا ہے اور ابد تک مستفید ہوتا رہے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حُسن و جمال کی ابدیت قرآن کی ان آیات میں موجود ہے۔

"والأنعام خلقها لكم فيها دفء و منافع و منها تاكلون و لكم فيها جمال حين تريحون و حين تسرحون و تحمل أثقالكم الى بلد لم تكونوا بٰلغيه الّا بشق الأنفس ان ربّكم لرء وف رحيم والخيل و البغال والحمير لتركبوها و زينة يخلق ما لا تعلمون"

(اُسی خدائے جمیل نے تمہارے لئے مویشیوں اور چوپایوں کو بنایا۔ ان سے تمہیں جاڑوں کا مقابلہ کرنے کا سامان مِلتا ہے۔ اسکے علاوہ اور بھی فائدے ہیں۔ تم انھیں کھاتے بھی ہو، ذرا اندازہ کرو، صُبح جب تم اپنے ریوڑ کو گھر سے نکالتے ہو اور جنگل لے جاتے ہو اور شام کو یہ ریوڑ لے کر گھر واپس آتے ہو تو یہ منظر کتنا حسین اور دِلکش ہوتا ہے۔ یہی جانور تمہارے بوجھ بھی ڈھوتے ہیں اور مشکل سفر میں تمہاری سہولت کا سامان بنتے ہیں یہ گھوڑے، خچر اور گدّھے، یہ تمہارے لئے سواری اور زینت کا سامان ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اللہ تمہارے لئے اور چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم ابھی جانتے نہیں۔)

قرآنِ حکیم میں حُسن و دل کشی کا جو یہ منظر بیان فرمایا گیا ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مال مویشی کے مالک ہیں اور صُبح کے وقت جب چرواہا اپنے ریوڑ لے کر جنگل کی طرف انھیں گھاس چرانے لے جاتا ہے اور

شام کے دھندلکے میں تانیں اڑاتا، بانسری بجاتا واپس آتا ہے تو یہ نظارہ واقعی حُسن و جمال کا مرّقع ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی معاشی زندگی سے ہے اور معاشی زندگی کی خوشحالی بذاتِ خود ایک حُسن ہے جس کو قرآن نے بہت اہمیت دی ہے۔ اسی سورۂ شریفہ میں آگے چل کر حسین و جمیل زندگی کا ایک اور مرقع پیش فرمایا گیا ہے:

”ھو الذی أنزل من السماء ماء لکم منه شراب و منه شجر فیه یسیمون ینبت لکم به الزرع الزیتون والنخیل و الأعناب و من کلّ الثمرات ان فی ذلك لآیة لقوم یتفکّرون“

(اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ یہ تمہارے پینے کے کام آتا ہے اور تمہیں زندگی عطا کرتا ہے۔ درخت اور گھاس اُگاتا ہے جس پر تمہارے مویشی پلتے ہیں۔ کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ زیتون اور انگور اور سیب کے باغ نظر فریب ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کے پھل کے درخت دیدہ و دِل کیلئے نور کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تمام خوبصورت، دِلکش اور دلآویز مناظر میں سمجھ دار لوگوں کیلئے بہت سے اشارات ہیں۔)

آگے چل کر فرمایا ہے:

” و سخّر لکم الیل و النھار و الشمس و القمر والنجوم مسخرات بأمره ان فی ذلك لآیات لقوم یعقلون“

(اللہ نے تمہارے لئے دِن اور رات کا حُسن و جمال پیدا کیا۔ چاند اور سُورج کی

ضیا پاشی تمہارے لئے مہیا کی۔ تاروں کو ایک خاص نظام کا تابع کر دیا تاکہ یہ تمہارے ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بن سکیں۔ اس میں بھی اُن لوگوں کیلئے اشارات ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔)

"وذرأ لكم في الأرض مختلفا ألوانه"

اللہ نے ہر چیز جو زمین پر پیدا کی، اسے اس طور پیدا کیا کہ ان کی مختلف اقسام ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں تاکہ تم اُکتا نہ جاؤ......

ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است

"و ألقى في الأرض رواسي أن تميد بكم، و أنهرا و سبلا"

(زمین پر سر بفلک پہاڑ موجود ہیں، پھر ان سے بلکھاتی، دوڑتی، گرتی سنبھلتی نہریں جاری ہیں۔ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے راستے موجود ہیں۔)

قرآن کے ان ارشادات کو پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ اسلام میں تصورِ جمال کیا ہے۔ خُدائے حسین وجمیل نے نبی جمیلؐ کے ذریعہ کتنا جمیل تصورِ حُسن بیان فرمایا ہے اور انسان کو اپنی زندگی میں جن چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے، اُنکے جمیل پہلوؤں کو کس طرح آشکار فرمایا گیا ہے۔ پہاڑ پر چڑھنے سے انسان کی زندگی خطرے میں بھی پڑ سکتی ہے، اسکا کہیں تذکرہ نہیں کیونکہ یہ اسکا حسین پہلو نہیں۔ دریاؤں اور ندیوں سے طغیانی بھی آتی ہے، اُسکا کہیں مذکور نہیں۔ کیونکہ یہ اسکا بدصورت پہلو ہے، خدائے بُزرگ وجمیل حُسن و جمال کا دِلدادہ اور اسکا خالق ہے، اس لئے وہ اسی کا ذکر فرماتا ہے......

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چوغلام آفتابم ہمہ زِ آفتاب گویم

اللہ تعالیٰ کے جو مختلف نام ہیں ان کو اسمائے حُسنیٰ کہتے ہیں۔ حُسنیٰ بھی حُسن سے مُشتق ہے اسکی دو قسمیں ہیں، جلالی اور جمالی۔ 99 اسمائے حُسنیٰ میں سے 15 جلالی ہیں اور باقی جمالی۔ کیوں نہ ہو "اللّٰہ جمیل و یحبّ الجمال" خدائے جمیل کے نبیؐ جمیل کا ارشاد ہے۔

☆☆☆

نفسِ امارہ

اللہ نے انسان کو پیدا کرتے وقت اس میں بے شمار صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ ان میں کچھ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور باہم مطابقت رکھتی ہیں اور کچھ صلاحیتیں ایسی ہیں جو ایک دوسری کی ضد ہیں اور ہمیشہ آپس میں برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر دو چیزیں لیجیے، حق اور باطل۔ دونوں کے جذبات انسان کے اندر موجود ہیں اور دونوں کی معرکہ آرائی شروع سے ہی جاری رہتی ہے۔ حق اور باطل کی اس جنگ میں کبھی حق کی جیت ہوتی ہے اور کبھی باطل اور پھر باطل ہار جاتا ہے حق فتح یاب ہو کر نکلتا ہے۔ اسی حق اور باطل کی جنگ کو دراصل نفوسِ انسانی کا نام دیا گیا ہے۔ جب یہ نفس باطل کی گرفت میں آجاتا ہے تو وہ ایسے ناگفتہ بہہ کام کرتا ہے جس کا ذکر کرنا بھی مذاق سلیم پر بار ہوتا ہے۔ باطل کی یہی گرفت اُس سے قتل و غارت کراتی ہے اوروں کے حق پر چھاپہ ڈلواتی

ہے۔ اپنی زندگی کو عیش و نشاط میں گذارنے کیلئے حرام کاری کراتی ہے۔ اُسے رحم، انصاف، عدل اور انسان دوستی کے جذبات چھین لیتی ہے۔ اگر کسی مرحلے پر انسان کو یہ احساس نہ ہوگا کہ وہ غلط راستہ پر چلتا ہے تو اُسی حالت میں مر بھی جاتا ہے اور اللہ بچائے یہ بڑی نامراد موت ہوتی ہے۔ اس کو نفسِ امارہ کہتے ہیں۔ امارہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اسے قرآن مجید میں نفس کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ انَّ النفسی لَاَمارۃُ بِسوٗ۔ میرا وہ نفس جو بُرائیوں کے ارتکاب کے احکام صادر کرتا رہتا ہے۔ اور انسان کی حق پرست جبلت کمزور ہوتو اس نفس کے ہر حکم کی تعمیل بلا چون و چرا اور آنکھیں بند کرکے کر لیتا ہے۔ اور ذرا سے غور کرنے کے بعد آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ نفسِ امارہ کی یہ اندھا دھند پیروی تمام فساد کی جھڑ اور تمام انسانی مصائب کا منبع ہے۔ یہی نفس امارہ کی پیروی انسان کو چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر بنا کر خونِ انسان کی ندیاں بہاتا ہے۔ یہی نفسِ امارہ انسان کو اپنی پکڑ میں جھکڑ کر چھوٹی بڑی چوریاں کرادیتا ہے، اوروں کا حق مار لیتا ہے، رحم، انصاف اور میانہ روی کی راہ سے ہٹا کر انسان کو انسان ہی نہیں رہنے دیتا۔ بلکہ وہ درندوں اور خون آشام حیوانوں کے صف میں جا کر داخل ہوجاتا ہے۔ اس نفسِ امارہ کی شرح قرآن مجید کی ہر آیت میں آپکو ملے گی۔ یہ اتنا وسیع اور بسیط مضمون ہے کہ اس پر دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے یہ ایک سرکش گھوڑا ہے جو کسی کے قابو میں نہیں آتا ہے۔ ایک شُترِ بے مہار ہے جو کسی کی نہیں سنتا اور صرف اپنے خواہشات کا غلام ہے۔ لل عارفہ نے قرآن مجید کے ایک مضموں کو اپنے ایک دوہے میں بڑی

خوبصورتی سے بیان کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ انسان سے مخاطب ہوکر فرماتی ہے کہ اس سرکش گدھے کو اپنے قابو سے باہر نہ جانے دے یہ جا کر اوروں کی کیسر کی کیاریوں میں جا کر اُنکی فصل تباہ و برباد کر دے گا۔ اسے بے بقابو چھوڑنے سے ایک دن تمہاری ننگی پیٹ پر تلوار چلے گی اس تلوار کا وار تمہارے سوا اور کون سہے گا۔ نفسِ امارہ کی حکمرانی کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اس دنیا اور صرف اس دُنیا کی زندگی کو حقیقت سمجھتا ہے اور یہ ماننے سے انکار کرتا ہے کہ اس چند روزہ زندگی کے بعد ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جب اُسے اپنے اعمال، افعال اور کردار کے بارے میں جواب دینا ہوگا۔ قرآن حکیم کی ایک آیت سے آپ کو نفس امارہ کی حقیقت معلوم ہوجائیگی۔ مفہوم یہ ہے کہ جب روزِ حساب قائم ہوگا اُس روز انسان کو معلوم ہوجائیگا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ نفسِ امارہ کی اطاعت کرنے والوں کو دوزخ کی آگ صاف دکھائی دے گی، وہی اُن کا ٹھکانہ ہوگا۔ پس جس نفس نے سرکشی کی ہوگی اور دُنیا کی چند روزہ زندگی کو ہی اپنا منزل سمجھ لیا ہوگا جہنم کی آگ اُسے اپنے آغوش میں لیگی اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے رہے اور اپنے نفس کو بداعمالیوں سے روکتے رہے اُن کی جائے پناہ جنت ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھئے جس طرح اللہ کی قدرت کاملہ نے حق اور باطل دو متضاد قوتیں پیدا کی ہیں اسی طرح سے نفسِ امارہ کے زہر کا تریاک بھی اُس نے فرمایا ہے، اُس کا نام نفسِ لوامہ ہے جس کی تفصیل انشااللہ پھر کبھی گوش گذار ہوگی۔

☆☆☆

نفسِ لوامہ

اس سلسلے کی پہلی بات چیت نفسِ امارہ پر ہوئی تھی جس میں عرض کیا گیا تھا کہ نفس جب بے قابو ہوجاتا ہے تو انسان پر مسلط ہوجاتا ہے اور اُسے ناک کے سیدھ چلاتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں اُسکی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ اور اپنے پیدا کرنے والے رب کے احکام سے روگردانی کرتا ہے اُس پر نفسِ امارہ کی شکل میں شیطان مسلط ہوجاتا ہے اور وہ ہر وقت اُسکے ساتھ لگا رہتا ہے۔ نیک کاموں سے دور اور بُرے کاموں کے قریب لانے میں ہر وقت اُسکا ساتھی بنا رہتا ہے۔ ....مگر جیسا کہ قانونِ قدرت ہے ہر زہر کے لئے ایک تریاق بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے جسے ہم antidot کہہ سکتے ہیں۔ نفسِ امارہ کے زہر کے لئے جو تریاق اللہ جل شانہٗ پیدا کیا ہے اُسے نفسِ لوامہ کہتے ہیں۔ یہ نفسِ لوامہ آخر ہے کیا چیز یہ بھی تو وہی نفس ہے جو امارہ بنتا ہے اور

تمام نتائج اور اواقب سے بے پرواہ ہوکر تباہی اور ابدی خسران کی راہ پر گامزن رہ کر بالآخر ابدی نقصان کا شکار بھی ہوجاتا ہے اور نفسِ لوامہ بھی وہی نفس ہے لیکن اس میں نفسِ امارہ میں ایک بہت بڑا فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ نفسِ امارہ کو اپنے اعمال پر کبھی پشیمانی نہیں ہوتی بلکہ وہ ان پر فخر کرتا ہے اور زیادہ شدت کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہوجاتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں نفسِ لوامہ سے بھی بدی سرزد ہوجاتی ہے مگر وہ اس پر فخر نہیں کرتا وہ اس پر پشیمان ہوجاتا ہے۔ اُس کا یہ نفس اُسے ابدی تباہی سے واپس لانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اُسے بدی کے ارتکاب کے بعد ملامت کرنے لگتا ہے کہ یہ تو نے کیا کیا؟ کیوں کیا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اس کا نتیجہ ابدی ہلاکت ہے۔ اس احساس کے قوی تر ہوجانے سے وہ آہستہ آہستہ نفسِ امارہ کے احکام کی تعمیل میں پہلے تامل کرنے لگتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اُسکی نافرمانی کرتا ہے اور کبھی اگر کوئی بُرا کام سرزد ہوجائے تو اُسے سخت ندامت ہوتی ہے اور جناب رسالت مآب صلی علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی اُسی صورتحال کی تفصیل ہے۔ فرمایا اگر تو نے نیکی کا کام کیا اور تیرا دل اُس سے مسرور ہوا اگر تجھ سے کوئی بدی سرزد ہوئی تو اُس پر نادم ہوگیا تو جان لو کہ ایمان کی علامت ہے اور تمہارا دل ایمان سے خالی نہیں ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں خونِ فاسد کے پیدا ہونے سے بہت سے امراض پیدا ہوجاتے ہیں اسی طرح نفس بھی خونِ فاسد ہوجانے سے روحانی امراض میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ جسمانی امراض کی تفصیل تو ہم سب جانتے ہیں۔ خدا بچائے

ہیضہ ہے، طاعون ہے، پیچش ہے، خسرہ ہے، چیچک ہے اور کیا کیا نہیں۔ لیکن جس مرض کے ظاہر ہوتے ہی ہم ڈاکٹر یا طبیب کے پاس جاتے ہیں، وہ تشخیص مرض کے بعد دوا تجویز کرتا ہے پرہیز بتلاتا ہے۔ ہم اس پر عمل کرتے ہیں اور اللہ شفاء بخشتا ہے۔ روحانی امراض کی بھی ہزاروں قسمیں ہیں مگر فرق یہ ہے کہ جسمانی امراض کا پتہ ہمیں بہت جلد ملتا ہے مگر روحانی امراض اور اسکے مضر اثرات کا پتہ آسانی سے نہیں لگتا ہے۔ یہ روحانی امراض جو نفسِ امارہ کی پیروی سے پیدا ہوتے ہیں کیا ہیں، حسد ہے، تکبر ہے، بغض اور عناد ہے، دل آزاری ہے، قتل و غارت ہے، چوری چکاری، حرام خوری، دہشت گردی اور حرام کاری ہے۔ اس کے اثرات بہت دیر کے بعد ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے انسان اُن کا علاج اتنا جلدی نہیں کرتا جتنا وہ جسمانی امراض کے دفع کے لئے کرتا ہے۔ نفسِ لوامہ وہ نعمت ہے جو انسان کو روحانی امراض سے آگاہ کرتا رہتا ہے اور اُس کی طرف اور اُسکے علاج کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہی نفسِ لوامہ اُسے اُن خدائی احکام کی طرح رہنمائی کرتا ہے جن میں پرہیز اور علاج بتایا گیا ہے۔ وہ اُن پر عمل کرتا ہے، اس عمل پر ڈٹ جاتا ہے اور شفاء پاجاتا ہے۔ اللہ جل و شانہٗ کا فرمان ہے:

.... جن لوگوں نے اقرار کیا ہے کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے اُنہیں نہ کوئی ڈر ہوگا نہ خوف ہوگا نہ اُن کو کبھی کسی غم سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن البتہ ایک امر ضروری ہے کہ صرف زبان سے کہنا کہ اللہ ہمارا رب ہے کافی نہیں ہے۔ جب آپ کہتے ہیں اللہ ہمارا رب ہے تو آپ کو یہ

بھی جانا چاہئے کہ وہ سمیع بھی ہے یعنی ہر بات سنتا ہے وہ بصیر بھی ہے ہر بات دیکھتا ہے ،.................... دلوں میں جو خیالات، اندیشے اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں اُن سے باخبر ہے۔ اس لئے ہرکام کرنے یا نہ کرنے کے وقت یہ خیال رہنا ضروری ہوگا کہ ہم سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہوجائے جو اللہ کے غضب کا باعث بنے۔ کیونکہ اس سے ہمارا کوئی قول، کوئی فعل اور کوئی خیال پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تب ہوگا جب نفسِ لوامہ کی تلوار سر پر لٹکتی رہے گی اور آپ نفسِ امارہ کے بجائے نفسِ لوامہ کی رہبری اور رہنمائی قبول کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپکونفسِ مطمئنہ کی سرمدی دولت حاصل ہوجائیگی جس کی تفصیل اگر خدا نے چاہا اور تو کسی اور صحبت میں عرض کی جائیگی۔

☆☆☆

نفسِ مطمئنہ

قرآنی اصطلاحات کے اس سلسلے میں اس سے پہلے نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ کی کسی قدر تفصیل بتائی گئی ہے اور آپ کو یاد دلانے کیلئے یہ بتادوں کہ نفسِ امارہ انسان کا وہ بے قابو نفس ہے جو ہوا و ہوس اور شہوات اور میلانات کی جستجو میں ایک منہ زور گھوڑے کی طرح بے لگام ہوتا ہے اور اس پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا علاج بھی پیدا کیا ہے اسی لئے نفسِ امارہ کی شرارتوں پر روک لگانے کے لئے انسانی نفس کی ایک اور شاخ بھی ہے جو نفسِ لوامہ کہلاتی ہے یہ نافرمانیوں اور شرارتوں سے پاک تو نہیں ہوتا مگر بدی ارتکاب کے بعد اُسے ندامت اور شرمندگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور اپنے کئے پر پشیمان ہوکر خود اپنے لئے بے قابو نفس کی ملامت کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک قسم کا توڑ ہے جو نفسِ امارہ کو مغلوب کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ اور یہ

نفس یعنی نفسِ لوامہ جب تک اپنا کام جاری رکھتا ہے نفسِ امارہ کو اپنے ارادوں میں پوری طرح سے کامیابی نہیں ہوتی۔ نفسِ امارہ اور نفسِ لوامہ کی یہ جنگ جاری رہتی ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب نفسِ لوامہ پوری طرح غالب آ کر نفسِ امارہ کے ارادوں کو شکست دیتا ہے اور اب انسانی نفس ہر کام کرنے سے پہلے دس بار سوچتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا اس کام کے کرنے سے پروردگارِ عالم کی خوشنودی حاصل ہوگی یا خدانخواستہ اُسکا غضب حرکت میں آئیگا۔ اسی طرح انسان کے نفس کی رفتہ رفتہ اصلاح ہوجاتی ہے۔ ایک مثال دیکر اس صورتحال کو واضح کیا جاسکتا ہے ۔ ایک آدمی فرض کیجئے بیمار ہے اور اُسے اپنی بیماری کا حال بھی معلوم نہیں، مگر کوئی دوسرا آدمی اُسکا ہمدرد ہے اُسے اُسکی بیماری کا حال معلوم ہے۔ وہ اسے اس سے خبر دار کرتا ہے، ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے، وہ اس کے لئے علاج اور پرہیز تجویز کرتا ہے اور نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ صحت یاب ہوجاتا ہے۔ بیمار آدمی نفسِ امارہ ہے اور اسکا ہمدرد دوست نفسِ لوامہ ہے جو اسے اسکی بیماری سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ علاج اور پرہیز کے بعد جب وہ صاف ہوجاتا ہے، صحت یاب ہوجاتا ہے تو اس کی ایک تیسری صورت بنتی ہے جس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ جب انسان کو یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے تو تمام پریشانیوں سے آزاد ہوکر اطمینان اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ...... اس ذہنی کیفیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اُسے نقصان ہوجائے اُس سے مایوس اور مکدر نہیں ہوتا، اُسے خوشی حاصل ہو یا کسی کام میں کامیابی ہو تو خوشی سے پھول نہیں جاتا ۔ اُسکی ذہنی

کیفیت ہر حال میں ایک جیسی رہتی ہے۔ اُس سے کوئی فکر پریشان نہیں کرتی، اُس سے کوئی کامیابی مغرور اور اپنے آپے سے باہر نہیں جانے دیتی، اُس کی زبان پر ہر وقت رہتا ہے الحمدُ للہ علیٰ کُل حال۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے واقعات میں مذکور ہے کہ وہ ایک روز اپنے رفیق کے ساتھ بات کررہے تھے اتنے میں ایک شخص آیا اور کہا میں آپکا ٹریڈ ایجنٹ ہوں اور بُری خبر لیکر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا خبر ہے وہ بولا ہم نے فلاں ملک کو ایک مال سے بھرا ہوا جہاز بھیجا تھا اس میں لاکھوں روپے کا مال تھا خبر آئی ہے کہ وہ جہاز سمندر میں گُم ہوگیا ہے، اندیشہ ہے کہ شاید ڈوب گیا ہو۔ آپؒ نے تھوڑے سے تحمل کے بعد کہا الحمدللہ۔ تم جاسکتے ہو۔ پھر اپنے رفیق کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ جیسا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چند دنوں کے بعد پھر آپ اُسی رفیق سے محو گفتگو تھے اور وہی ٹریڈ ایجنٹ پھر آیا اور کہا میں ایک اچھی خبر لیکر آیا ہوں۔ فرمایا کہو، کہا میں نے کچھ دن پہلے ایک تجارتی جہاز کی گمشدگی کی خبر آپ کو دی تھی اب اطلاع ملی ہے کہ وہ جہاز محفوظ ہے اور منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ آپؒ نے پھر زرا سے تحمل کرنے کے فرمایا الحمد للہ، اچھا تم جاسکتے ہو۔ آپ کے رفیق نے کہا حضرت جب وہ جہاز کی گمشدگی کی خبر لیکر آیا تو آپ نے الحمد للہ کہا، اب اس کی بازیابی کی خبر لیکر آیا تو آپ نے پھر الحمد للہ کہا، اس میں کیا راض ہے۔ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب یہ ایجنٹ مجھے جہاز کی گمشدگی کی خبر دے گیا تو میں نے اپنے دل سے پوچھا تمہیں کوئی افسوس تو نہیں ہوا، اُس

نے کہا نہیں، اس پر میں نے الحمدللہ کہا۔ آج جب وہ یہ خبر لیکر آیا کہ جہاز ہاتھ آیا ہے میں نے پھر اپنے دل سے پوچھا تمہیں خوشی تو نہیں ہوئی، اُس نے کہا نہیں، اس پر میں نے اللہ کا شکریہ ادا کیا اور الحمد للہ کہا۔ اسی کیفیت کو نفسِ مطمئنہ کہتے ہیں اور یہی کیفیت زندگی کا ماحاصل ہے اور اسی کے لئے قرآن مجید میں یہ بشارت دی گئی ہے: اِرجعی اِلَیٰ رَبِک راضیۃً مَرضیۃً فادخُلی فی عبادی و ادخُلی جنتی، اس دُنیا سے نکلتے وقت اس نفسِ مطمئنہ سے کہا جایئگا کہ اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ اس حال میں کہ تو بھی ہم سے راضی ہو اور ہم بھی تم سے راضی ہوں۔ آؤ میرے خاص بندوں میں شامل ہوکر جنت کی سدابہار باغوں کی سیر سے لطف اندوز ہوجاؤ۔

☆☆☆

تصورِ انقلاب اور معرکہ کربلا

انقلاب کے معنی ہے کسی ناگوار صورتحال کو بدلنا ۔ اور اُس کی جگہ ایک خوشگوار ماحول پیدا کرنا۔ اس کی ضرورت کب ہوتی ہے ۔ اس کی ضرورت تب ہوتی ہے جب ایک ظالم اور جابر قوم جان لیوا ہتھیاروں کی مدد سے کسی غریب اور نہتے گروہ پر جبراً اپنا قبضہ جمائے۔ اس محکوم و مجبور گروہ کے مالی وسائل اُس سے چھین کر اُسے افلاس اور ناداری کے عذاب میں گرفتار کرے اور خود رنگ رلیاں منائے۔ جب ایک ظالم قوم اپنی محکوم کی زبانوں پر تالے ڈالے اور اُنہیں اُف تک کرنے کی اجازت نہ دے یہاں تک کہ وہ دم گھٹ کر مر جائے۔ جب ایک زبردست قوم اپنے لاو ولشکر کے ذریعے دوسری قوم یا کمزور گروہ تمام حقوق غصب کرلے، جب شرافت کی جگہ شرارت کی حکمرانی ہو، جب اخلاق ک ے بجائے رزائل کی حکمرانی ہو۔ جب آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ کردار پر لوگ روک لگا

دی جائے۔ جب شرافت کے تمام اصول پامال ہو جائے تو محکوم قوم کے لئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنکر اُٹھ کھڑا ہونا، توپوں سے لڑنا، بندوقوں کے سامنے سینہ سپر ہونا ضروری بن جاتا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں ظالم اور مظلوم حاکم اور محکوم کی یہ کشمکش اور جابر و مجبور کے درمیان یہ تصادم ہمیشہ سے چلتا آیا ہے۔ ظالم اور جابر طاقتوں نے ہمیشہ طاقت استعمال کر کے مجبوروں اور مظلوموں کو خاموش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ کوشش آخر کار ناکام ہوگئی ہے۔ مجبور اور مظلوم جب جبر اور ظلم کا خاتمہ کرنے کا آہنی عزم لیکر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ایک ناگوار صورتحال کو بدل کر اُس میں ایک خوشگوار تبدیلی لانا چاہتا ہے۔ یہ کام ایسا ہے جو صبر، استقامت، ایثار اور قربانی مانگتا ہے۔ کیونکہ استحصال کرنے والی طاقت تو کسی بھی صورت میں اپنی شہنشاہی اور اپنے سامانِ عیش کو پلیٹ پر رکھ کر مظلوم کے سامنے نہیں رکھتا۔ مظلوم اور مجبور کو معلوم ہوتا ہے کہ اُسے یہ چیز دی نہیں جائے گی اُسے یہ چیز جبراً چھیننی ہوگی۔ اور چھینا جھپٹے میں لہو بھی گرے گا، سر بھی کٹیں گے، گھر بھی لٹیں گے، قتل و غارت بھی ہوگا، عصمتیں بھی برباد ہوں گی مگر انجام یہ ہوگا کہ ظالم اپنے ظلم سمیت تباہ ہوجائیگا۔ باطل کا پرچم سرنگوں ہوگا اور حق کا جھنڈا بلند ہوگا۔ ایک مفکر کا کہنا ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ حق پرست مغلوب اور مفتوح بھی ہوجاتا ہے۔ مادی قوتوں سے تہی دست بھی ہوجاتا ہے۔ لیکن اُسکا یہ احساس اُس سے ایک لمحہ کیلئے بھی جدا نہیں ہوتا کہ وہی بلند و برتر ہے۔ اس لئے کہ وہ حق پر ہے۔ وہ اپنے کو فاتح اور ظالم سے اونچا سمجھتا ہے۔

اُس کو یقین ہوتا ہے ایک ہنگامی دور ہے گزر کر رہے گا۔ اُس سے باطل کی حکمرانی کے بعد اُس باطل کی حکمرانی کے بعد حق کی حکمرانی کا دور ہوگا۔ ظلم اور جہالت کی بادشاہی کے بعد انصاف اور انسان دوسی کا دور آئیگا ۔ وہ اقبال کا دور ہوگا جس کے لئے فنا نہیں ۔ بلاشبہ اس کا بھی امکان ہے کہ اسی مغلوبیت کے عالم میں اس کا خاتمہ ہوجائے مگر پھر بھی وہ سرنگوں کیوں ہوگا ۔ مرنا تو سبھی کو ہے۔ البتہ وہ حق اور انصاف کی لڑائی لڑتے لڑتے اونچا درجہ پائیگا۔ اور ظالم جب بھی مرے گا، تو اُس پر رہتی دُنیا تک پھٹکار پڑتی رہے گی۔ یہی انقلاب ہے اور اس انقلاب کو جنم دینے کیلئے دُنیا بھر میں لاکھوں لڑایاں لڑی گئیں ہیں۔ ماضی قریب میں فرانس میں انقلاب ہوا۔ روس میں انقلاب آیا۔ ہندوستان کے عوام نے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا کر نہتے ہونے کے باوجود اُس ظالم اور جابر سامراج سے ٹکر لی جس پر ایک زمانے میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور آج وہ سامراج سمٹ سمٹا کر اپنے ایک چھوٹے سے جزیرے میں دبک کر رہ گیا ہے اور ہندوستان آزادی کی دولت سے ہمکنار ہے۔ ہندوستان کی آزادی نے ایشیا کے تمام ملکوں کو آزادی دلا دی۔ افریقہ کے ممالک کو غلامی کی لعنت سے آزاد کر دیا۔ اور انقلاب نے ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے لا کر رکھ دی۔ بس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ناگوار سماجی، سیاسی اور اخلاقی صورتحال کو بدلنے کیلئے جدوجہد کرنا اور اُس کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے پر تیار رہنے کا نام انقلاب ہے۔ اور یہی انقلاب ہے جو قوموں اور اُمتوں کو زندہ رکھتا ہے اور دُنیا میں اُنہیں

سرخ رو بنا کر عزت کے قابل بنا دیتا ہے۔ اِن اصولوں کی روشنی میں اگر ہم کربلا کے واقعہ کو پرکھ لیں تو نہ صرف یہ کہ یہ واقعہ انقلاب کے عوامل کا مکمل ردعمل ہے بلکہ اُس واقعہ نے انقلاب کی ضرورت، انقلاب کی ہئیت اور انقلاب کی ماہئیت کی عملی تصویر دُنیا کے سامنے رکھ دی ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام بذات خود ایک عظیم الشان انقلاب تھا، یہ فکر ونظر کا انقلاب تھا، قول وفعل کا انقلاب تھا، جسم اور روح کا انقلاب تھا اور کون نہیں جانتا کہ اُس زمانے میں نہ صرف جزیرۂ نما عرب میں بلکہ ساری دُنیا میں اِس انقلاب کی اشد ضرورت تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے پیغمبر آئے تھے ، انہوں نے خدا پرستی، انسان دوستی، اخلاق اور اعمال صالح کی تعلیم دی تھیں۔ انبیائے سلف کی یہ ساری تعلیمات بُھلا دی گئی تھیں۔ مفاد پرستوں نے تاویلات کا دروازہ کھول کر اصلیت کو غائب کر دیا تھا اور ساری تعلیمات مسخ ہو چکی تھی۔ اسلام کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اِن تمام تعلیمات کو زندہ کرنے کے لئے آئے اور صرف 23 سال کے عرصہ میں ایک ایسا صالح نظام حیات قائم کر گئے جس کی نظیر نہ اس سے پہلے ملتی ہے اور نہ اس کے بعد۔ پیغمبر خداؐ کے انتقال ظاہری کے صرف چند سال بعد ایک گروہ پیدا ہوا جنہوں نے اسلام کے نام پر اپنی بالا دستی اپنی شہنشاہی قائم کر لی۔ اسلام جو شہنشاہی اور سامراج کا خاتمہ کر چکا تھا خود اس کا شکار ہوااور خلافت راشدہ کے بعد خلافت ختم ہوئی اور سلطانی شروع ہوگئی۔ نام انہوں نے بھی اپنا خلیفہ ہی رکھا، اُسے بادشاہ نہیں کہا مگر کام بادشاہوں کے تھے۔ دربار داریاں قیصر وکسریٰ کی تھی۔ وہی

جلالِ بادشاہی، وہی سلطنت کا طنطنہ، وہی جبروت، وہی باادب با ملاحظہ ہوشیار کا سماں جو رومت الکبریٰ کے ایوانوں اور ایران کے بادشاہوں کے ہاں مروج تھا، اِن تمام نام نہاد خلفاء نے اپنے لئے پسند کیا۔ اس سے پہلے امیر بننے کیلئے ضروری تھا کہ وہ عوام کے لئے قابل قبول ہو، یہ شرط ہٹا دی گئی۔ اس سے پہلے امیر کیلئے ضروری تھا کہ اس کا کردار بے داغ ہو، اور قرآن و سنت میں بتائے ہوئے اصولوں کا پیرو ہو، یہ شرط بھی کالعدم قرار دی گئی۔ اصول یہ بنا کہ جس کے قبضے میں سونا چاندی ہو اور جس کے پاس لوہا اور فولاد ہو وہ اُس سے لوگوں کو ڈرا دھمکا سکے، وہی خلافت کا مالک ہوگا۔ عہد رسالت ابھی ذہنوں سے بالکل فراموش نہیں ہوا تھا، اور اس بابرکت عہد سے مستفید ہونے والے ابھی بہت سے اصحاب زندہ تھے وہ اس صورتحال کو دیکھ دیکھ کر کڑتے تھے احتجاج کرتے تھے اس کے خلاف علے الاعلان فتوے صادر فرماتے تھے مگر طاقت اور دولت کے بل بوتے پر ایمان رکھنے والے ان کو خاموش کر دیتے۔ اسی بابرکت عہدِ رسالت کے ایک بزرگ دبستان رسالت کے شاگرد اور آغوش نبوت کے پروردہ امام حسینؓ بھی تھے۔ انہوں نے رسولؐ کا زمانہ دیکھا تھا، پایا تھا، خلافت راشدہ کا عہد دیکھا تھا۔ اُن کو معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے پیغام کا مقصد کیا تھا اور اُس مقصد سے کس طرح غداری کی جارہی ہے، انہوں نے اس صحیح ظلم کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور قیصر و کسریٰ کی راہ پر چلنے والوں کو رسول خدا کی راہ دکھانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انتہا درجہ کی بے سرو سامانی کے ساتھ ایک ایسی

طاقت سے الجھ گئے جس کے پاس آزمودہ کار فوج تھی، اسلحہ اور گولہ بارود تھا، تیغ و تفنگ تھا اور سب سے بڑی بات وہ قہاری تھے جس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ظاہرہ طور پر یہ اقدام مصلحت سے دور تھا مگر حق کا بول بالا کرنے والے مصلحتوں کے پابند نہیں ہوا کرتے ہیں وہ اللہ کے شیر ہوتے ہیں اور باطل کا جبروت انہیں بھنبھناتی مکھیوں کی طرح بے وقعت نظر آتا ہے۔ کربلا کے میدان میں جو معرکہ ہوا وہ حق و باطل کا معرکہ تھا، سیاح و سفید کی جنگ تھی اور نور و ظلمت کا تصادم تھا۔ وقتی طور پر باطل اور اندھیرا کامیاب ہوا، حسینؓ نے اپنی جان اور اپنے خاندان کے افراد کے جان کی قربانی ضرور دی مگر اس خون سے اُس کھیتی کی آبیاری ہوئی جس کو رسول خداؐ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کاشت کے قابل بنالیا تھا۔ استعمار پرستوں کی کوشش تھی کہ یہ کھیتی سوکھ جائے اور واقعہ یہ ہے کہ اس پر مردنی چھائی ہوئی تھی مگر حسینؓ نے اُسے اپنے اور اہلِ خاندان کے خون سے پھر سینچا اور کھیتی پھر سے لہہ لہانے لگی۔ اصولاً اگر دیکھا جائے اور اگر زرا سا غور کیا جائے تو صاف نظر آیگا کہ اگر حسین یہ اقدام نہ فرماتے مصلحت سے کام لیکر باطل کے ساتھ خدانخواست سمجھوتہ کر لیتے تو اسلام کا خاتمہ اُسی روز ہوگیا ہوتا۔ جاہ و جلال کی سطوت نے کلمۂ حق ظاہر کرنے والے لوگوں پر مہر لگا دی ہوتی۔ سلطنت کی مرعوبیت نے انسان کو مصلحت کوش اور بزدل بنا دیا ہوتا۔ امام حسین اور اُنکے ساتھیوں نے ساری امت اور سارے عالم انسانیت کو بتادیا کہ اِس قسم کی موت موت نہیں ہوتی، حیاتِ جاودانی ہوتی ہے۔ ظالم کی زندگی زندگی نہیں بدترین

موت ہوتی ہے جو اس کا خاتمہ تو نہیں کرتی لیکن مرگِ مسلسل میں گرفتار کرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں اُسے ہر لمحہ موت سے سابقہ پڑتا ہے مگر وہ مرتا نہیں وہ مرنے کی تمنا کرتا ہے لیکن موت اُسے ٹھکرا دیتی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ میں تمہاری ناپاک روح کو قبض کر کے اپنے آپ کو آلودہ نہیں کرنا چاہتی۔ انسانی شرافت کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے جو شخص ظالمانہ نظام کو للکارتا ہے اور اُسے فنا کر کے ایک شریفانہ نظم زندگی قائم کرتا ہے وہی سچا انقلابی ہے۔ انقلاب کی ضرورت ہر زمانے میں ہوتی ہے۔ اور انسانی اعلیٰ اقدار کی پاسبانی اور حفاظت کے لئے پرانے، جاہل اور فرسودہ نظام کو تباہ کر کے صالح نظام زندگی کی بنیادیں مضبوط کرنے کا کام ہر انسان کا فرض ہے۔ وہ نظام جہاں راست بازی ہو، دھوکہ فریب نہ ہو، ایک پیاس سے جاں بلب اور دوسرا بدمستی سے عالم نزع میں نہ ہو، جہاں ہمدردی ہو، دلداری ہو، انصاف ہو، عدل ہو، جہاں شرافت کی قدر ہو اور رزالت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اسی فریضہ کی ادائیگی کا نام انقلاب ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جو آج سے کم و بیش 14 سو سال پہلے کربلا کے میدان میں بپا کیا گیا تھا اور جس نے اس انقلاب بپا کرنے والوں کو آبِ حیات پلا دیا۔

☆☆☆

اسلام اور مشترکہ قومیت کا تصور

- مولانا آزاد کی نظر میں

اسلام غالباً دُنیا کے تمام مذاہب میں سے ایک مذہب ہے جس کا دعوے[1] ہے کہ وہ اپنی ہمہ گیری اور جامعیت کے لحاظ سے دُنیا کا آخری مذہب ہے۔ نوعِ انسانی کے لئے ہدایت کا آخری سر چشمہ اور اِنسانی جہالت کے اندھیرے کا آخری چراغ ہے۔ اسلام سے پہلے جتنے بھی ادیان وملِل آئے اُن میں سے کسی کا یہ دعویٰ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک خاص مذہب کوئی خاص تعلیم لے کر آتا تھا، انسان اس مذہب پر کچھ دیر تک چلتا اور پھر وقت کے گذُرنے کے ساتھ ساتھ یُوں معلوم ہونے لگتا جیسے اس مذہب کی تعلیم اب کام کی نہیں رہی۔ تو ایک اور ہادی مامور ہو جاتا۔ جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق حق پرستی کی تعلیم کی تجدید کرتا۔ بُنیادی طور پر تمام داعیان مذہب کی تعلیم ایک تھی۔ البتہ

حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر اندازِ دعوت مختلف ہوتا تھا۔ مثلاً نمرود کے زمانے میں عقلیت پرستی، استدلال اور منطق کا سخت زور تھا۔ ہر بات کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت عام تھی اور جس بات کو عقل تسلیم نہ کرتی اُس پر ایمان لانا مشکل تھا۔ عقلیت پرستی اور معقولیت بُری چیز نہیں۔ لیکن جب حد سے گذرتی ہے تو مُہلک بن جاتی ہے۔ نمرود کے زمانے میں معقولیت پرستی نے یہی مُہلک صورت اختیار کی تھی۔ چنانچہ جب اس ہلاکت کے غار سے نوعِ انسانی کو نکالنے کا ارادہ مشیّت الٰہی کو ہوا تو حضرت ابوالانبیا أبراہیم علیہ السلام دُنیا کو ہدایت کی طرف بُلانے کے لئے مبعوث ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنا کام شروع کیا تو انھیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوا اور معقولیت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ظاہر ہے کہ ابتدا میں انھوں نے استدلال کا جواب استدلال سے ہی دیا۔ اور کوشش یہ کی کہ مخالف جس ہتھیار سے لیس ہے، خُود اسی ہتھیار سے اُس کو شکست دیں، مگر آخر ایک وقت ایسا بھی آیا جب حضرت ابراہیم کو یہ ہتھیار چھوڑنا پڑا۔ اور عقل کا جواب عشق سے دینا پڑا۔ انھوں نے آگ میں کود کر نمرود اور اُس کے ہم نواؤں کی عقلیت پرستی کا جواب دیا اور عقل حیران ہو کر رہ گئی۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اسی طرح حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانے کا بادشاہ فرعون تھا۔ جولاؤ لشکر، فوجی طمطراق اور شاہانہ جاہ وجلال کی مدد سے اپنی بات منواتا تھا۔ موسیٰ

علیہ السلام، فرعونؔ اور اس کے مشن کو شکست دینے کے لئے مبعوث ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام کو خود وہی ہتھیار اُٹھانا پڑا جس پر فرعونؔ اور اُس کے حواریوں کو ناز تھا۔ تلوار کا جواب تلوار نے دیا اور بالآخر فرعونؔ اور اُس کا سارا جاہ و جلال غرقِ آبِ نیل ہو کر رہ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم نے بنی اسرائیل کو قدرتی طور پر جنگ جو بنا دیا۔ ابتدا میں یہ جنگی جذبہ باطل کے خلاف پروان چڑھا تھا۔ مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اصل مقصد فوت ہوا۔ اور بنی اسرائیل کی جنگ جوئی نے اللہ کی سرزمین کو خاک و خون میں لت پت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے پھر چاہا کہ نوعِ انسانی کو اس عذاب سے نجات دِلائی جائے اور نبی عفت و عصمت و غم خواری و کم آزاری حضرت سیدنا مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ جنھوں نے حکم دیا کہ کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تُم دوسرا گال پیش کر دو...... دوسرے کی آنکھ کا تِنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ لو...... زِنا کرنے والی عورت کو سنگسار ضرور کرو، مگر پہلا پتھر وُہ مارے جس نے خود کبھی زِنا نہ کیا ہو۔

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ اگلے زمانوں میں ہادی اور پیغمبر آئے۔ حالات کے مطابق نوعِ انسانی کو رشد و ہدایت کی راہ پر لگاتے گئے۔ مگر جب امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیمات کی رُوح افسردہ ہوتی گئی۔ تو حالات کو سُدھارنے کے لئے دوسرے ہادی آتے گئے۔ اسلام آیا۔ اُس نے بھی نوع انسانی کی تمام خرابیوں کا انسداد کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی تھا کہ اسلام

کے بعد کوئی دوسرا مذہب اور داعی اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا داعی، کوئی دوسرا ہادی، کوئی دوسرا پیغمبر نہیں آئے گا تو کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ حضورؐ کے بعد نوع انسانی کبھی شرارت نہیں کرے گی؟ نوع انسانی کبھی گمراہ نہیں ہوگی۔ نوع انسانی ہدایت کے سرچشمہ صافی کو چھوڑ کر طغیانی اور سرکشی کے گدلے پانی سے اپنی پیاس نہ بجھائے گی؟ ظاہر ہے کہ ایسا خیال کرنا ٹھیک نہیں۔ انسان کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ زیادہ دیر تک نیکی اور صلاح کی راہ پر نہیں چلا۔ وہ بھٹکا اور بُری طرح سے بھٹکا۔ تو پھر اسلام کے آخری مذہب اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری داعی ہونے سے جو نقصان ہونے کا امکان تھا، اُس کا کیا علاج تھا۔ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ اسلام آخری مذہب کیوں ہے اور حضورؐ آخری نبی کیوں ہیں۔ کیونکہ یہ اس مقالے کا موضوع نہیں۔ میں صرف یہی کہوں گا کہ اسلام کی تعلیمات نے حضورؐ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے بعد اپنی بقا کی کون سی صورت اختیار کی۔ اور مزید داعیانِ مذہب کی ضرورت سے بے نیاز ہو کر کس طرح نہ صرف اپنے وجود کو قائم رکھا بلکہ ترقی کی منزلیں بھی طے کرتا گیا...... اس مقالے کا موضوع درحقیقت یہی ہے اور اس میں ضمناً مولانا ابوالکلام آزاد کے اُس نظریے کی وضاحت بھی ہوگی جو اُنہوں نے قرآن مجید کی آیات سے حاصل کیا ہے۔

پُرانے وقتوں میں جو ضرورت پیغمبر پُوری کیا کرتے تھے وہ رسول اللہؐ کی اُمت کے علماء نے پُوری کی۔ حضورؐ نے فرمایا تھا۔ "علماء أمتی كأنبياء بنی

اسرائیل"، میری اُمت کے عالموں کا وہی درجہ ہے جو بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور اسلام کی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن اور رسولؐ کی سُنت ہے۔ قرآن خُدا کا کلام ہے حضورؐ پر نازل ہوا اور خود حضورؐ ہی کے زمانے میں محفوظ ہوا۔ اسلام کے علماء میں بڑے بڑے اختلافات پیدا ہوئے۔ مگر قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور اس کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہونے کے بنیادی معاملے میں آج تک کبھی کوئی اختلاف نہ ہوا۔ سُنّتِ رسولؐ کو صحابہ کرام نے محفوظ کرلیا۔ جان نثارانِ نبوّت اور شمعِ رسالت کے پروانوں نے حضورؐ کی ہر حرکت، ہرادا، ہرانداز، ہرفرمان اور ہر بات کو عشق کی نظروں سے دیکھا اور اِسے اپنی لوحِ دل پر مرتسم کرنے کے بعد اوروں تک منتقل کرتے گئے...... اور اس طرح سُنّتِ رسولؐ کا سرمایہ بھی کلام مجید کی طرح بلا چون و چرا محفوظ ہو گیا...... قرآن اور سُنّتِ کو بلا تشبیہہ میں یہ کہوں گا کہ وہ آنے والے علمأ کے لئے خام مواد تھا...... اس سے اُنہوں نے عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں۔ ہر معمار اپنے فن میں طاق تھا۔ مگر اس کے باوجود ہر معمار کا فنِ تعمیر اپنا تھا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، ایک کا فن دوسرے کے فن کے ساتھ نہیں ملتا۔ مفسرین، محد ثین، مجتہدین، فقہا، علماء و قُراء کی مثال یہی ہے۔ وہ سب اپنے اپنے فن میں بے مثال تھے۔ مگر اس کے باوجود ایک کا فن دوسرے کے فن کے ساتھ تمام و کمال نہیں ملتا تھا۔ یہاں اختلافات پیدا ہوتے گئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان اختلافات میں ذاتیات کا کوئی پہلو نہ تھا۔ یہ اختلاف نیک نیّتی پر مبنی تھا۔ علماء کی ایک جماعت نے قرآن و سنت

سے استنباط کیا کہ قرآن مخلوق ہے۔ دوسری جماعت نے اسی قرآن سے ثابت کیا کہ قرآن مخلوق نہیں اس اختلاف نے خلفائے بنی عباسیہ کے زمانے میں بڑی خوفناک صورت بھی اختیار کر لی۔ مگر اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ قائم ہے کہ دو متضاد نظریوں کے علم برداروں کی نیّت ہمیشہ صاف تھی۔ وہ دیانتداری سے اپنے موقف کو دُرست سمجھتے تھے اور اس پر قائم تھے۔ اُن کی نیّتوں پر شک کرنا اپنی عاقبت خراب کرنا ہے۔ تو قرآن اور سنت کی تاویل میں ہر عالم اور ہر مُفسر و محدث نے دِل سوزی اور حُسنِ نیت کے ساتھ کام کیا۔ مگر اختلافات بھی رُونما ہوتے رہے۔ صحابہ کرام کے بعد اسلام میں سب سے بڑا درجہ أئمۂ أربعۃ حضرت امامِ مالکؒ، حضرت امامِ ابوحنیفہؒ، حضرت امامِ شافعیؒ اور حضرت امامِ احمد حنبلؒ کا تھا۔ یہ چاروں بُزرگ بہت بڑے فقیہہ، محدث عالم اور مجتہد تھے۔ انھوں نے فقہِ اسلامی کو اپنی اپنی صوابِ دید سے مُرتب اور مُدوّن کر دیا۔ چاروں کا اندازِ فکر نہیں ملتا۔ کیونکہ ایسا ممکن بھی نہیں۔ مگر بنیادی باتوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ فروعات میں اختلاف ہوسکتا ہے اور ہے، ائمہ اربعہ کے بعد ہر دور اور ہر زمانے میں مسائل سامنے آتے گئے اور علماء اپنی صواب دید کے پیش نظر ان مسائل کو حل کرتے گئے۔ بعض نے ایک کی تاویل کو مانا۔ بعض نے دوسرے کی تاویلات کو قابل قبول جانا اور حقیقت یہ ہے کہ ان ہی علماء کی گرہ کُشائیوں نے اسلام کو بہت سے لاینحل عقدے کھول کر رکھ دیئے اور آج اسلام کے اصول و فروع کی جو مختلف صورتیں ہمارے سامنے ہیں وہ ان ہی علمائے کرام کی مرہونِ

مِنّت ہیں جنھیں داعی اسلامؐ کی بصیرت نے انبیائے بنی اسرائیل کا درجہ دیا تھا۔

فلسفہ، ادب، سائینس، تاریخ غرض علم کے کسی شعبے کو دیکھئے، تو آپ کو نظر آئے گا کہ ایک ہی زمانے میں دو عظیم المرتبت انسان ایک ہی میدان میں پیدا ہوئے۔ دونوں کا مقصد ایک تھا۔ مگر اندازِ فکر اپنا اپنا تھا۔ ابوالفرج ابن جوزی رحمتہ اللہ علیہ بھی اسلام اور اصولِ اسلام، قانونِ شریعت اور احیائے دین کے مِشن پر کام کر رہے تھے اور اسی زمانے میں سیدنا و مولانا شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ بھی لوگوں کو گمراہی کے غار سے نِکال کر روحِ ہدایت پر فائز کر رہے تھے۔ مگر ابنِ جوزی اور شیخ جیلانیؒ کے اندازِ فکر میں سخت تضاد تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹھیک نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود دونوں میں سے ایک کی نیت پر شک کرنا سخت نادانی ہے۔ ابن جوزی عقل کے پرستار اور معقولیت کے امام تھے۔ شیخ جیلانیؒ عشق کے پروانے اور سپردگی کے پیکر تھے۔ دونوں کی منزل ایک تھی، دونوں کا محبوب ایک تھا۔ دونوں کی راہ ایک تھی مگر اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے اندازِ رفتار کو دُرست نہ سمجھتے تھے۔ اس سے نقصان کچھ نہیں ہوا فایدہ ہُوا۔ معقولیت کے پرستاروں نے عقلِ گیرہ کُشا کے تمام پہلو بے نقاب کئے۔ اور عشق کی اُمت نے عشقِ خانماں برباد کے جمالِ جہاں آرا سے فکر و عقل کی دُنیا کو منور کر دیا۔ انسان اور تہذیب انسانی کا سرمایہ بڑھا، گھٹا نہیں۔ فکرِ انسانی کو جِلا مِل گئی۔ داغ نہیں لگا۔ حقیقتیں اُجاگر ہوتی گئیں۔ اُن پر غلاف نہیں چڑھا۔ ادب کے میدان میں دیکھئے۔ مصحفی اور انشا ایک ہی زمانے میں پیدا ہوئے۔ دونوں

باکمالوں نے ادب کو بامِ عروج پر پہنچایا۔ دونوں نے جنگیں بھی لڑیں۔ دونوں نے مناظرے اور مباحثے بھی کئے اور بعض دفعہ ان مناظروں اور مباحثوں نے ناگوار صورت بھی اختیار کی۔ مگر دونوں کا مقصد ادب کو ترقی دینا تھا۔ اس بُنیادی مقصد میں اختلاف نہ تھا۔ فروعات میں اختلاف تھا اور فروعات میں اختلاف ہونا چاہیئے۔ میرؔ اور سوداؔ، آتشؔ اور ناسخؔ، چکبستؔ اور شررؔ، نسیمؔ اور میر حسنؔ، ادب اُردو کی چند اور مثالیں ہیں جن سے میرے اس دعوے[1] کی تائید ہوتی ہے کہ علم و ادب، فلسفہ و دانش کی گرہیں کھولنے کے لئے ہر زمانے میں باکمال پیدا ہوئے اور اپنی سی کوشش کرتے گئے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنے والی نسلوں کو علم و ادب اور فلسفہ و دانش کا ایک بیش بہا ذخیرہ اور قیمتی سرمایہ ہاتھ آیا۔ قرآن و سنت کی تفسیر و توضیح، تشریح و تاویل کے سلسلے میں گذشتہ چودہ سو برس میں جتنے عظیم الشان علماء، فقہا، محدثین و مفسرین نے کام کیا ہے۔ اُن کے اگر صرف نام لکھنے لگیں تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔

خلفائے بنی عباسیہ کے زمانے میں خلق قرآن کے مسئلے نے نازک صورت اختیار کر لی تھیں۔ تو کسی دوسرے زمانے میں بحثِ نظیر نے زور پکڑا تھا۔ ہر زمانے میں اختلافات پیدا ہوتے رہے اور ہمارے زمانے میں بھی ایک مسئلہ بڑی شدت اختیار کر گیا۔ یہ مسئلہ وطنیت اور قومیت کا ہے۔ پچاس سال تک غیر منقسم ہندوستان میں اس مسئلے نے بہت سے مُفکروں کو پیدا کیا، بہت سے نئے خیالات سامنے آئے اور بہت سے غوامِض منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔

ہر زمانے کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں مغربی افکار کی حکمرانی ہے۔ مغرب کو مشرق پر مادّی غلبہ رہا اور مشرق نے ہر معاملے میں مغرب کو اپنا امام بنانے کی کوشش کی۔ وطنیت اور قومیت کا تصور مشرق میں مغرب کی طرف سے آیا۔ مگر مسلمان قدرتی طور پر ہر نئے تصور کو قرآن اور سنت کی کسوٹی پر رکھنا چاہتا ہے اور جب یہ تصور اس محک پر کھرا نکلتا ہے تب اُسے قبول کرتا ہے ہندوستان میں جب انگریزی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی تحریک زور پکڑ گئی تو اس کی بنیاد یہی وطنیت اور قومیت قرار پا گئی۔ ہندوستان میں دو طاقتیں تھیں...... ہندو اور مسلمان۔ ہندو نے قومیت کو بلا چوں و چرا تسلیم کیا۔ مگر مسلمانوں کو اُس وقت تک اس کے قبول کرنے میں تامل رہا جب تک وہ اُس کا جواز قرآن و سنت سے حاصل نہ کر سکے۔ قدرتی طور پر مسلمان علماء کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے قومیت اور وطنیت کو عینِ اسلامی تصور کہا اور دوسرے گروہ نے اسے اسلام کی رُوح کے منافی قرار دیا۔ تصور کے اس اختلاف نے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے بدظن کیا وہاں مسلمانوں اور مسلمانوں میں بھی تفریق پڑ گئی۔ قومیت کو اسلامی قرار دینے والوں کی سب سے با اثر جماعت جمعیۃ العلمائے ہند کی تھی۔ جس میں ہندوستان کے کبار علماء شامل تھے۔ مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی خُدا داد ذہانت، بے پناہ علم و فضل کی بنا پر اس جماعت کے نفسِ ناطقہ ہیں۔ اس مقالے کا موضوع یہی ہے۔

قومیت کو اسلامی اور غیر اسلامی بتانے والے علماء کے پاس اپنے اپنے دلائل تھے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبالؒ کے درمیان بحث و تکرار نے جو ناگوار صورت اختیار کی، وہ ابھی تک پڑھے لکھے لوگوں کو یاد ہو گی۔ قومیت کو غیر اسلامی کہنے والوں کا استدلال یہ تھا کہ وطن اور قوم کی اسلام میں کوئی حیثیت نہیں بلکہ یہ صرف اسلام ہے جو نوعِ انسانی کو ایک لڑی میں پرو سکتا ہے۔ اس تصور کے سب سے بڑے مناد علامہ اقبالؔ تھے۔ اُنھوں نے فرمایا۔

ان تازہ خُداؤں میں سے بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

وہ ایک چھوٹے سے قطعہ زمین کے لئے اپنی صلاحیتیں صرف کرنے کو افلاسِ تخّیل کہتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک اسلام کے فرمانے کے مطابق ساری زمین خُدا کی ہے۔ انسان خُدا کا خلیفہ ہے اور اس خلافت کا سزاوار وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اسلام کے اصولوں پر کاربند رہے۔ اس لئے وطن کی کوئی اہمیت نہیں۔ انسان اور سچے مُسلمان بنو۔ یہ ساری زمین تمہارے قدم چومے گی۔

ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خُدائے ماست

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ قوم کے لئے وطن ضروری ہے اور وطن کا استخلاص قوم کی ترقی کے لئے لازمی۔ آپ کا جملہ تھا۔ قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ ان کے اس اظہار کو اقبالؔ نے سخت

ناپسند کیا اور انھوں نے حسین احمد کے عنوان سے یہ تین شعر لکھے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — زِ دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود برسرِ منبر کہ مِلّت از وطن است — چہ بے خبر زِ مقامِ محمد عربیؐ است

بمصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — گر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

مولانا حسین احمد مدنی نے ظاہر ہے کہ اقبالؒ کی اس چٹکی کو سخت محسوس کیا اور انھیں اس کی تلخی محسوس ہوئی۔ چنانچہ جواباً انھوں نے ایک پمفلٹ لکھا اور اس میں فرمایا کہ اقبالؔ نے غلط الزام تراشی کی ہے۔ میں نے کہا ہے۔ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اقبالؔ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے یہ کہا ہے کہ ملّتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ میں نے قوم کہا ہے اور مِلّت نہیں کہا ہے۔ قوم الگ چیز ہے اور مِلّت دوسری چیز ہے۔ مِلّت کے لئے وطن کا ہونا ضروری نہیں۔ مگر قوم وطن کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اقبالؔ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مولانا حسین احمد مدنی عالم ہیں اور علم لغت کے ماہر ہیں۔ وہ اس ہیرا پھیری میں اصل مبحث کو نظر سے گول کرنا چاہتے ہیں۔ میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں اور محمد عربیؐ کی راہ کے بغیر کسی دوسری راہ سے واقف نہیں۔

قلندر جز دو حرف لا اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

یہ اور اسی قسم کے بہت سے معرکے ہوئے اور عام طور پر اس تصور نے مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کیا۔ دونوں گروہ اپنے اپنے نظریے کی تائید

میں شدّ ومدّ سے دلائل دیتے گئے اوراس نظریاتی اختلاف نے اچھی خاصی نزاع بین المسلمین کی صورت اختیار کی۔ فریقین کے مردِ میدان لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں اُتر آئے۔ ایک طرف سے مولانا ظفرعلی خان کی شاعرانہ قہر سامانی تھی تو دوسری طرف سے مولانا عطاالله شاہ بُخاری کی سحر بیانی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نظریاتی اعتبار سے جمعیتہ علماء اور مجلسِ احرار کے ہم نوا تھے مگر وہ بحث ومناظرہ کی پست سطح پر نہ اُترے۔ البتہ اُن کی ژرف نگاہی اور عمیق نظر نے تفریق بین المسلمین کے مرض کی تشخیص کی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی یہ نظریاتی جنگ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بھی تفریق پیدا کر رہی ہے اور اس سے اصل مقصد یعنی تحریکِ حصولِ آزادی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اُن کی بصیرت نے فیصلہ کیا کہ اس فروعی اختلاف میں پڑنے کے بجائے اُس بُنیادی صداقت کے غوامض کو روشن کر دیا جائے جس کا سرچشمہ قرآن ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اجتہاد سے قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا۔ اور سب سے پہلے سُورہ فاتحہ کی تفسیر لکھی جو بذاتِ خود ایک مُدّلِل اور مبسوط کتاب بن گئی۔ اور اُم القرآن کے نام سے شائع ہوئی۔ مولانا نے جب تفسیر قرآن کا کام آگے چلایا تو سُورہ فاتحہ کی تفسیر بھی حصہ اوّل کا جُزو بن گئی۔ مگر اب ساہتیہ اکاڈمی نے اسے الگ سے بڑے آب وتاب سے شائع کیا ہے۔ مولانا نے قومیت کے مسئلے کو اگرچہ براہِ راست نہیں چھیڑا ہے مگر تفسیر سُورۂ فاتحہ میں اجتہادی نقطۂ نظر سے اُس حقیقت کُبریٰ کو واضح کر دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہدایت ہر انسان کا خزانہ ہے اور اللہ تعالیٰ

ہدایت کو ایک گروہ یا ایک فرقہ یا ایک طبقہ سے مخصوص نہیں فرماتا۔ یہ ایک خوان نہیں ہے جو چاہے آکر اس دسترخوان سے اپنا پیٹ بھر لے۔ یا اس سرچشمہ سے اپنی پیاس بُجھا دے۔ مولانا نے قرآن کریم کی اس تفسیر سے سارے عالم انسانیت کی خدمت کی۔ انھوں نے فرمایا کہ نزاع بین المسلمین تو خیر معمولی سی چیز ہے۔ مگر قرآن کریم کی تعلیم تو یہ ہے کہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ انسان اور انسان میں مذہب کی وجہ سے دُوری نہیں ہوسکتی۔ انسان اور انسان کے درمیان اختلافِ زبان دُشمنی کا باعث نہیں بن سکتا۔ انسان اور انسان کے درمیان اختلاف رنگ ونسل، مذہب و مِلت یا وطن مخاصمت کا سبب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور اُس کا انعام ہدایت ہے جو کسی خاص طبقے، خاص مذہب یا خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں۔ یہ ایک انقلابی نظریہ تھا جس نے لوگوں کے ذہنوں کو تہ و بالا کر دیا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ مولانا کی اس نئی تاویل وتفسیر کو ہر ایک نے قبول کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونہیں سکتا تھا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی یہ مان لیا گیا کہ مولانا کا یہ انداز انقلابی اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت کو پُورا کرنے کا کفیل۔

قرآن کی تفسیر کرنے سے پیشتر مولانا نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر لِکھ کر ثابت کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ متن ہے تو قرآن اس کی شرح۔ جو حقائق قرآن حکیم میں بکھرے پڑے ہیں۔ وہ سب سورۂ فاتحہ میں جمع ہیں اور ان حقائق کا لُب لباب یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، حقیقت ایک ہے۔ حقیقت کی راہ سیدھی ہے۔

گُمراہی کے راستے بے شُمار ہیں اور ان میں سے کوئی سیدھا نہیں۔ ہدایت عام ہے اور ذہن ایک ہے۔ جس وقت ان حقائق کو مان لیا جائے تو چھوٹے چھوٹے جھگڑوں، معمولی اختلافات اور نزاعات کی کوئی جگہ نہیں رہتی۔ ایک وطن کے اندر مختلف نظریات رکھنے والوں کے درمیانی جھگڑوں کا ہی وجود نہیں مِٹ جاتا بلکہ سارا عالم انسانیت ایک لڑی میں پرو دیا جاتا ہے۔ اور انسان اُس حقیقت کُبریٰ کو پہچانتا ہے جس کے لئے اُس کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ اس مختصر سے تعارف کے بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ افکار پیش کروں گا جن سے قرآن حکیم کی روشنی میں قومیت بین الاقوامیت کا اصول سامنے آتا ہے۔

ایک بات کا صاف کرنا ضروری ہے۔ دُنیا میں جس قدر مذاہب ہیں اُن کے نام اُن کے بانیانِ مذاہب کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً عیسےٰ علیہ السلام کے دین کے پیرو مسیحی کہلاتے ہیں۔ مہاتما بُدھ کے مُتبعین بودھ کہہ کر پُکارے جاتے ہیں وغیرہ۔ اس کے برعکس محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو لے کر آئے اُس کا نام اسلام ہے اور اس کو ماننے والے مُسلمان کہلاتے ہیں۔ محمدی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ابوالکلام اس کا جواب دیتے ہیں:

قرآن نے دین کے لئے "الاسلام" کا لفظ اس لئے اختیار کیا ہے کہ اسلام کے معنی کسی بات کے مان لینے اور فرمان برداری کرنے کے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دین کی حقیقت یہی ہے کہ خُدا نے جو قانونِ مساوات انسان کے لئے ٹھہرایا ہے اُس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ وہ کہتا ہے، یہ کچھ انسان ہی

کے لئے نہیں بلکہ تمام کائنات ہستی اسی اصل پر قائم ہے۔ سب کے بقا و قیام کے لئے خدا نے کوئی نہ کوئی قانون عمل ٹھہرا دیا ہے اور سب اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ اگر ایک لمحے کے لئے بھی رُوگردانی کریں گے تو کارخانہ ہستی درہم برہم ہو جائے گا۔

'أفغير دين الله يبغون و له أسلم من في السموت و الأرض طوعا أو كرها و اليه يرجعون'

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین ڈھونڈ نِکالیں۔ حالاں کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، سب چارونا چار اسی کے ٹھہرائے ہوئے قانونِ عمل کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور بالآخر سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔)

قرآن جب کہتا ہے کہ الاسلام کے سِوا اللہ کے نزدیک کوئی دین مقبول نہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دین حقیقی کے سِوا جو ایک ہی ہے اور تمام رسُولوں کی مشترک تعلیم ہے، انسانی ساخت کی کوئی گروہ بندی مقبول نہیں۔ سورۂ آل عمران میں جہاں یہ بات بیان کی ہے کہ دینِ حقیقی کی تمام راہ مذہبی رہنماؤں کی تصدیق اور پیروی کی راہ ہے، وہیں متصلاً یہ بھی کہہ دیا ہے:

'و من يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه و هو في الآخرة من الخاسرين۔'

(اور جو کوئی اسلام کے سِوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو یاد رکھو، اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اور وہ آخرت کے دِن دیکھے گا کہ تباہ ہونے والوں میں سے ہے۔)

اور اسی لئے قرآن تمام پیروان دعوت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ دین میں تفرقہ اور گروہ بندی سے بچیں۔ اور اسی گُمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے قرآن نے نجات دِلائی ہے۔ وہ کہتا ہے میری دعوت نے تمام انسانوں، جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے، خُدا پرستی کی راہ میں اس طرح جوڑ دیا کہ ایک دوسرے کے جان نثار بھائی بن گئے۔ ایک یہودی، جو پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کا نام سُنتے ہی نفرت سے بھر جاتا تھا، ایک عیسائی جو ہر یہودی کے خون کا پیاسا تھا، ایک مجوسیٰ جس کے نزدیک تمام غیر مجوسیٰ ناپاک تھے ایک عرب، جو اپنے سِوا سب کو انسانی شرف و محاسن سے تہی دست سمجھتا تھا، ایک صحابی جو یقین کرتا تھا کہ دُنیا کی قدیم سچائی صرف اُسی کے حصے میں آئی ہے۔ ان سب کو دعوت قرآنی نے ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے نفرت کرنے کی جگہ ایک دوسرے کے مذہبی رہنماؤں کی تصدیق کرتے اور سب کی بتائی ہوئی متفقہ راہ ہدایت پر گام زن ہیں:

'واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا و لا تفرّقوا واذکروا نعمة اللّٰہ علیکم اذ کنتم أعداء فألّف بین قلوبکم فأصبحتم بنعمته اخوانا۔'

(اور دیکھو سب مل جُل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ اور جُدا جُدا نہ ہو۔ اللہ نے تُم پر جو فضل و کرم کیا ہے اُسے یاد کرو۔ تمہارا حال یہ ہو رہا تھا کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دِلوں میں باہم دِگر اُلفت پیدا کر دی۔ پھر ایسا ہوا کہ انعام الٰہیٰ سے بھائی بھائی ہو گئے۔)

قرآن حکیم کی ان آیات سے مولانا ابوالکلام نے یہ انقلابی نظریہ واضح کر دیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کی اشاعت کی وہ وہی دین فطرت تھا جس کی تعلیم حضورؐ سے پہلے تمام انبیا دیتے آئے تھے۔ انھوں نے کسی نئے دین کی تبلیغ نہیں کی۔ اور اُن کے دین کا نام اسلام اسی لئے ہے کہ یہ قانونِ فطرت کی پیروی کی ہدایت کرتا ہے۔ ہر وہ شخص، جو قانون فطرت کا پیروَ ہے، مسلمان ہے، چاہے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانا پسند کرے یا نہ کرے۔ پھر اس کے باوجود قرآن کریم کی تعلیمات سے رُوگردانی کرنے والے کیوں پیدا ہوئے۔ اور یا حضرت داعی اسلامؐ کے مبعوث ہونے کی ضرورت کیا تھی، اس کا جواب مولانا ابوالکلام یُوں دیتے ہیں:

رسُولؐ نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا: مجھ سے پہلے جتنے بھی پیغمبر آ چکے ہیں، میں سب کی تصدیق کرتا ہوں اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی خُدا کی سچائی کا انکار سمجھتا ہوں۔

رسُولؐ نے کسی مذہب کے ماننے والے سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ اپنے مذہب کی دعوت سے انکار کر دے۔ بلکہ جب کبھی مطالبہ کیا تو یہی کیا کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم پر کاربند رہو۔ کیونکہ تمام مذہبوں کی اصل تعلیم ایک ہی ہے۔ اُس نے نہ تو کوئی نیا اصول پیش کیا، نہ کوئی نیا عمل بتایا۔ اس نے ہمیشہ ان ہی باتوں پر زور دیا جو دُنیا کے تمام مذاہب کی سب سے زیادہ جانی بُوجھی ہوئی باتیں رہی ہیں۔ یعنی ایمان اور عملِ صالح۔ اُس نے جب کبھی لوگوں

کو اپنی طرف بُلایا ہے تو یہی کہا ہے: اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقت از سرِ نو تازہ کرو۔ تمہارا ایسا کرنا ہی مجھے قبول کر لینا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی دعوت کا یہ حال تھا تو پھر آخر اس میں اور اس کے مخالفوں میں وجہ نزاع کیا تھی۔ ایک شخص کو، جو کسی کو بُرا نہیں کہتا، سب کو مانتا اور سب کی تعظیم کرتا ہے اور ہمیں ان باتوں کی تلقین کرتا ہے جو سب کے یہاں مانی ہوئی ہیں، کوئی اس سے لڑے تو کیوں لڑے۔ اور کیوں لوگوں کو اس کا ساتھ دینے سے انکار ہوا۔

کہا جاتا ہے، قریشِ مکہ کی مخالفت اس بنا پر تھی کہ قرآن نے بُت پرستی سے انکار کیا تھا اور وہ بُت پرستی کے طریقوں سے مالوف ہو چکے تھے، بلاشبہ ایک وجہِ نزاع یہ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہودیوں نے کیوں مخالفت کی جو بُت پرستی سے قطعاً کنارہ کش تھے؟ عیسائی کیوں برسرِ پیکار ہو گئے جنھوں ے بُت پرستی کی حمایت کا دعویٰ نہیں کیا؟ اصل یہ ہے کہ پیروان مذاہب کی مخالفت اس لئے نہ تھی کہ وہ انھیں جھٹلاتا کیوں ہے بلکہ اس لئے تھی کہ جھٹلاتا کیوں نہیں۔ ہر مذہب کا پیرو چاہتا تھا کہ وہ صرف اسے سچا کہے، باقی سب کو جھٹلا دے۔ چونکہ وہ یکساں طور پر سب کی تصدیق کرتا تھا، اس لئے کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہودی اس بات سے تو بہت خوش تھے کہ قرآن، حضرت موسیٰ کی تصدیق کرتا ہے، لیکن وہ حضرت مسیح کی بھی تصدیق کرتا تھا۔ اور یہیں آ کر اس میں اور یہودیوں میں نزاع شروع ہو جاتی تھی۔ عیسائیوں کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا

کہ حضرت مریم کی پاکی کا اعلان کر دیا جائے؟ لیکن قرآن صرف اتنا ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ نجات کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے نہ کہ کفارہ اور اصطباغ پر۔ اور قانونِ نجات کی یہ عالم گیر وسعت عیسائی کلیسا کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔"

مولانا نے قرآن کی عالم گیر تعلیم اور اسلام کی ہمہ گیر تعریف کر کے نہ صرف ایک قوم کے دو فرقوں کے درمیان ہونے والے نزاعوں کا دروازہ بند کر دیا بلکہ دُنیا بھر کی قوموں کو دعوت دی کہ وہ قرآن کی روح کو سمجھیں اور اپنے اپنے دین کی پیروی کرنے کے باوجود اسلام کے دائرے میں آجائیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انسان کا اعتقاد اور عمل صالح ہو۔ مولانا کا یہ انقلابی تجزیہ ساری دُنیا کو ایک لمحہ فکریہ دیتا ہے اور نہ صرف قومیت کے معنی سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ بین الاقوامیت اور انسانی شرافت کے دائرہ کار کو وسیع تر کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے ارشادات کی یہ دِلچسپ توجیہہ جہاں ایک طرف سے قرآن کی خدمت ہے وہاں یہ انسانی شرافت کے لئے بھی ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا کا اجتہاد یہ ہے کہ دین ایک ہی ہے، البتہ منہاج اور شریعت الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ کیونکہ ساری، نوعِ انسانی کو ایک ہی ڈگر پر چلانا ممکن نہیں ۔ لیکن منہاج اور شریعت کا اختلاف دین کی بنیادی سچائیوں پر نظر انداز کیسے ہوسکتا ہے۔ قرآن تو اس کا مخالف ہے اور داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور کردار سے ثابت فرمایا ہے کہ منہاج اور

شریعت کے اختلاف کے باوجود جہاں تک دین کی بنیادی صداقتوں کا تعلق ہے اُن پر اتفاق ہوسکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل مولانا کے الفاظ میں یہ ہے:

(۱) نزولِ قرآن کے وقت دُنیا کا مذہبی تخیّل اس بات سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا کہ نسلوں، خاندانوں اور قبیلوں کی معاشرتی حدبندی کی طرح مذہب کی بھی ایک خاص گروہ بندی کر لی گئی تھی۔ ہرگروہ کا آدمی سمجھتا تھا کہ دین کی سچائی صرف اسی کے حصے میں آتی ہے جو انسان اُس کی مذہبی حد بندی میں داخل ہے، نجات یافتہ ہے اور جو داخل نہیں، نجات سے محروم ہے۔

(۲) ہرگروہ کے نزدیک مذہب کی اصل و حقیقت محض اس کے ظاہری اعمال ورسوم تھے۔ جوں ہی ایک انسان انہیں اختیار کر لیتا، یقین کیا جاتا کہ نجات و سعادت اُسے حاصل ہوگئی۔ مثلاً عبادت کی شکل، قربانیوں کے رسوم، کسی خاص طعام کا کھانا یا نہ کھانا، کسی خاص وضع وقطع کا اختیار کرنا یا نہ کرنا۔

(۳) چونکہ یہ اعمال و رسوم ہر مذہب میں الگ الگ تھے اور ہر گروہ کے اجتماعی مُقتضیات یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے ہر مذہب کا پیروُ یقین کرتا تھا کہ دوسرے مذہبی صداقت سے خالی ہے۔ کیونہ اس کے اعمال و رسُوم ویسے نہیں ہیں جیسے خُود اُس نے اختیار کر رکھے ہیں۔

(۴) ہر مذہبی گروہ کا دعویٰ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ سچا ہے بلکہ یہ بھی کہ دوسرا جھُوٹا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہرگروہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ تھا کہ اپنی سچائی کا اعلان کر دے بلکہ یہ بھی ضروری سمجھتا کہ دوسروں کے خلاف تعصب ونفرت

پھیلائے۔ اس صورتِ حال نے نوعِ انسانی کو ایک دائمی جنگ و جدال میں مبتلا کر دیا تھا۔ مذہب اور خُدا کے نام پر ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرتا اور اس کا خون بہانا جائز سمجھتا۔

(۵) لیکن قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے مذہب کی عالم گیر سچائی کا اصول پیش کیا:

ا۔ اس نے صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر مذہب میں سچائی ہے، بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اُس نے کہا دین خُدا کی بخشش عام ہے، اس لئے ممکن نہیں کہ کسی ایک کو دیا گیا ہو، دوسروں کا اس میں کوئی حصہ نہ ہو۔

۲۔ اُس نے کہا: خُدا کے تمام قوانین فطرت کی طرح انسان کی رُوحانی سعادت کا قانون بھی ایک ہی ہے اور سب کے لئے ہے۔ پس پیروان مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انھوں نے دین اِلہیٰ کی وحدت فراموش کر کے الگ الگ گروہ بندیاں کر لی ہیں اور ہر گروہ بندی دوسری گروہ بندی سے لڑ رہی ہے۔

۳۔ اُس نے بتایا: خُدا کا دین اس لئے تھا کہ نوع انسانی کا تفرقہ اور اختلاف دُور ہو۔ اس لئے نہ تھا کہ تفرقہ و نزاع کی علت بن جائے۔ پس اس سے بڑھ کر گمراہی اور کیا ہوسکتی ہے کہ جو چیز تفرقہ دُور کرنے کے لئے آئی تھی، اسی کو تفرقہ کی بنیاد بنا لیا ہے۔

۴۔ اُس نے بتایا کہ ایک چیز دین ہے اور ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا۔ اور یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی۔ اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو، ویسے ہی احکام و اعمال بھی اس کے لئے اختیار کئے جائیں۔ بس شرع و منہاج کے اختلاف اصل دین سے مختلف نہیں ہو جا سکتے۔ تُم نے دین کی حقیقت تو فراموش کر دی ہے۔ محض شرع و منہاج کے اختلاف پر ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہو۔

(۵) اس نے بتلایا کہ تمہاری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے ظواہر و رسوم کو نجات و سعادت میں کوئی دخل نہیں۔ یہ گروہ بندیاں تمہاری بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ خُدا کا ٹھرایا ہوا دین تو ایک ہی ہے۔ وہ دین حقیقی کیا ہے؟ ایمان اور عملِ صالح کا قانون۔

(٦) اس نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ اس کی دعوت کا مقصد اس کے سِوا کچھ نہیں کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ مگر پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں اگر وہ فراموش کردہ سچائی کو ازسرِنو اختیار کر لیں تو میرا کام پُورا ہو گیا۔ اور انھوں نے مجھے قبول کیا۔

(۷) وہ کہتا ہے خُدا کا دین اس لئے نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کرے بلکہ اس لئے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے محبت کرے۔ اور سب ہی پروردِگار کے رشتہ عبودیت میں بندھ کر ایک ہو جائیں۔ جب سب

کا پروردِگار ایک ہے، سب کا مقصود اُس کی بندگی ہے۔ تو پھر خُدا اور مذہب کے نام پر یہ تمام جنگ ونزاع کیوں ہے؟

(۸) نوعِ انسانی کی باہمی یگانگت اور اتحاد کے جتنے رشتے ہو سکتے تھے، سب انسانوں کے ہاتھوں ٹوٹ گئے۔ سب کی نسل ایک تھی۔ مگر ہزاروں نسلیں ہو گئیں۔ سب کی قومیت ایک تھی۔ مگر بے شمار قومیں بن گئیں۔ سب کی وطنیت ایک تھی، لیکن سینکڑوں وطنوں میں بٹ گئے۔ سب کا درجہ ایک تھا۔ لیکن امیر و فقیر، شریف و رذیل، ادنی اعلیٰ کے بہت درجے ٹھہرائے گئے ہیں۔ ایسی حالت میں کون سا رشتہ ہے جو ان تمام تفرقوں پر غالب آسکتا ہے اور تمام انسان ایک ہی صف میں کھڑے ہو جا سکتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خُدا پرستی کا رشتہ...... ہی ایک رشتہ ہے جو انسانیت کا بچھڑا ہوا گھرانا پھر آباد کر سکتا ہے۔ یہ اعتقاد کہ ہم سب کا پروردِگار ایک ہے اور ہم سب کے سر اسی ایک چوکھٹ پر جُھکے ہوئے ہیں، یک جہتی ویگانگت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ ممکن نہیں انسان کے بنائے ہوئے تفرقے اس پر غالب آسکیں۔ یہ اقتباس طویل ہوا۔

لذیذ بُود حکایت دراز تر گفتم

مطلب اس سب کا یہ ہوا کہ انسان بہ حیثیت نوعِ انسانی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے۔ ان سب کو چھوٹی چھوٹی مصلحتوں نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ مگر اصل ان کی ایک ہے۔ ان سب کو پھر ایک ہو جانا چاہیئے۔ اور وہ

کون سی شے ہے جو اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو دوبارہ جمع کر سکتی ہے۔ مولانا کے خیال میں اس کی اساس خُدا پرستی ہے۔ دین ہے۔ وہ دین کو، جو ایک ہی ہے اس اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد نیشنلسٹ ہی نہیں بلکہ انٹرنیشنلسٹ ہیں اور اپنے افکار کی بنیاد انھوں نے قرآن حکیم کے ارشادات پر رکھ کر ایک اجتہادی درجہ حاصل کیا ہے۔ وہ قومیت اور وطنیت کو بھی ایک تنگ دائرہ سمجھتے ہیں۔ چہ جائے کہ وہ ایک ہی قوم میں مختلف قومیتوں اور ایک ہی وطن میں مختلف وطنیتوں کو قابلِ قبول سمجھیں۔ اَن کا نظریہ آفاقی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سارے انسان مِل کر خُدا کی اس سرزمین کو آباد کریں۔ اُس نے رات بنائی ہے یہ لوگ مِل کر رات کے اندھیرے کو اپنی جلائی ہوئی شمعوں سے بُقعہ نور بنا دیں۔ اُس نے ٹھیکری بنادی ہے۔ انسان مِل کر اسے مُناسب تراش خراش کے بعد اس سے پیالہ بنا دیں۔ جو کسی پیاسے کی پیاس بجھانے کے کام آئے۔ اُس نے کوہ و بیاباں بنا دئے، سارے انسان مِل کر خون پسینہ ایک کریں اور ان بے آب و گیاہ میدانوں، فلک بوس پہاڑوں کو اپنی عرق ریزی سے خیابان و گلزار و باغ میں بدل دیں اور اس طرح اس قابل ہو جائیں کہ وہ اپنا سر فخر سے بلند کر کے کہہ سکیں۔

قصور وار غریب الدیار ہوں، لیکن
ترِا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اقبالؔ نے رُوحِ ارضی کی طرف سے آدم کا استقبال ان لفظوں میں کرایا تھا۔

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جُدائی کے سِتم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکہ بیم و رجا دیکھ

☆

سمجھے گا زمانہ ترِی آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترِے تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک ترِی آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے شہر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت ترِی پنہاں ہے تیرے خُونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

مگر کیا ایک تازہ جہاں آباد ہو سکتا ہے۔ اگر انسان تعمیرِ انسانیت کے عظیم مقصد سے رُوگردان ہو کر اور حقیقت عظمیٰ سے کٹ کر اور چھوٹی چھوٹی گروہ

بندیوں میں بٹ کر منتشر ہو جائے۔ انسان کی جنت بے شک اُس کے خُونِ جگر میں پنہاں ہے، بشرطیکہ اُس کی کوشش پیہم سیدھی راہ پر ہو۔ اور سیدھی راہ ہر انسان کے لئے بخششِ عام کی طرح مہیا ہے۔ ایک سخت کوش اور جفاکش انسان بھی غلط راستے پر چل کر منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ سیدھی راہ ایک ہی ہے اور اس کی تفصیل ان صفحات میں آئی ہے...... مولانا کے خیالات سے لفظ بہ لفظ متفق ہونا ضروری نہیں۔ لیکن سُننے اور غور کرنے میں کیا حرج ہے۔

' أفلا يتدبّرون القرآن أو على قلوب أقفلها '

(آیا یہ لوگ قرآن کے متعلق غور نہیں کرتے۔ کیا ان کے دِلوں پر تالے پڑے ہیں۔)

☆☆☆

وہ ایک سجدہ......

یہ اگست 1945ء کا واقعہ ہے۔ ہندوستان بھر میں 1942ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع ہوئی تھی اور قبل اس کے کہ ایک ہمہ گیر مہم چلائی جاتی کانگریس کے تمام سرکردہ ارکان کو قید کر دیا گیا تھا، کانگریس کی زمامِ صدارت مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ میں تھی، انھیں اپنے تمام رفیقوں سمیت بمبئی میں گرفتار کر کے احمد آباد کے قلعے میں محبوس کر دیا گیا تھا، اُن کی اس گرفتاری سے ہمیں ایک بہت بڑا فائدہ ہوا، وہ یہ کہ دنیائے ادب کو غبارِ خاطر ایسا شاہکار ہاتھ آیا۔ 1946ء تک حالات بدل چکے تھے، جنگ ختم ہوئی تھی اور انگلستان کا سامراج فاتح ہونے کے باوجود اپنی ساکھ کھو بیٹھا تھا اور وہ جزیرہ انگلستان کی طرف اپنی ساری توجہ مرکوز کر کے اپنی نوآبادیوں کو چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا، چنانچہ 1942ء میں جن زعماء کو قید کر دیا گیا تھا، اُنھیں نہ صرف غیر مشروط طور پر عزّت

کے ساتھ رہا کیا گیا، بلکہ حکومت نے اُن کے ساتھ انتقالِ اقتدار کے مسئلے پر بھی سنجیدگی سے بات چیت شروع کی، مولانا آزادؒ کو رہا کیا گیا تو اُن کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ شاید قید و بند کے مصائب سے نہیں، جس کے وہ عادی تھے اور جس کو انھوں نے اپنی زندگی کے معمولات میں شامل کیا تھا مگر اُن کی صحت کی بُربادی کا سبب غالبًا اُن کی رفیقہ حیات کی موت تھی جو اِسی دوران واقع ہوئی تھی اور جسے اُنھوں نے بڑے صبر وتحمل سے برداشت کرتے ہوئے لکھا تھا:

"آنچہ دل از فکرآں مے سوخت بیم ہجر بُود
آخراز بے مہرئے گردوں بہ آن ہم ساختیم"

بالآخر 9/اپریل کو زہرِ غم کا یہ پیالہ لبریز ہوگیا۔

فانّ ما تحذرين قد وقع

اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی، ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنا پڑی ہے، میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافلِ نیم ز راہ وے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دل آگاہ می زنند

یہاں اِحاطہ کے اندر ایک پُرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب

سے آیا ہوں سینکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن اب اسے دیکھتا ہوں تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ایک نئے طرح کا اُنس اس سے طبیعت کو پیدا ہو گیا ہو، کل شام کو دیر تک اُسے دیکھتا رہا اور مہتمم بن فُویرہ کا مرثیہ جو اُس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا۔

قد لامنى عند القبور على البكاء

رفيقى لتذراف الدموع الوافك

فقال أتبكى كلّ قبر رأيته

لقبر ثوى بين اللوى فالدارك

فقلت له ان الشجا يبعث الشجا

فدعنى، فهذا كله قبر مالك

میرے رفیق نے جب دیکھا کہ قبروں کو دیکھ کر میرے آنسو بہنے لگتے ہیں تو اُس نے مجھے ملامت کی، اُس نے کہا یہ کیا بات ہے کہ اُس ایک قبر کی وجہ سے جو ایک خاص مقام پر واقع ہے تو ہر قبر کو دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ میں نے کہا بات یہ ہے کہ ایک غم کا منظر دوسرے غم کی یاد تازہ کر دیا کرتا ہے لہذا مجھے رونے دے، میرے لئے تو یہ تمام قبریں مالک کی قبریں بن گئی ہیں۔

یہ مختصر سا اقتباس میں نے اس لئے دیا ہے کہ طبیعت پر جبر کرنیکی وجہ سے مولانا مرحوم کی صحت بُرباد ہو گئی تھی چنانچہ وہ رہائی کے بعد وقت ملتے ہی سرینگر آئے اور یہاں وہ ایک ہاوس بوٹ میں اور پھر گلمرگ میں مُقیم ہوئے،

سرینگر کے ایک اجلاس میں انھوں نے بڑی مختصر سی تقریر کی تھی اور فرمایا تھا کہ میں یہاں کے پہاڑوں میں اپنی کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں آیا ہوں، مجھے اب بھی یاد ہے کہ مولانا نے جو شِروانی پہن رکھی تھی وہ اُن کے دُبلے پتلے بدن پر بہت ڈھیلی معلوم ہوتی تھی اور واقع یہی ہے کہ وہ یہاں کسی سرگرمی میں حصہ لینے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اپنی صحت بحال کرنے اور اپنی اہلیہ مرحومہ کی موت کے غم کو بھلانے کے لئے آئے تھے۔ اتفاق سے اگست 1945ء کا مہینہ رمضان المبارک کا مہینہ بھی تھا۔ وہ حضرت بل کے گھاٹ سے ذرا دور ایک شاندار ہاؤس بوٹ میں فروکش تھے اور اس ہاؤس بوٹ کا محل وقوع اس لحاظ سے بے حد دلفریب تھا کہ سامنے نشاط شالہ مار، چار چناری اور ڈل کی وسیع پہنائیاں تھیں اور بغل میں نسیم باغ کا پُرشکوہ حُسن و جمال، جمعہ کا دِن تھا، میں مولانا محمد سعید صاحب مسعودی کے ساتھ حضرت بل نماز پڑھنے گیا تھا وہاں انھوں نے مجھ سے کہا کہ نماز سے پہلے چلو تمہیں مولانا آزاد سے مِلا دوں۔ مجھ پر مولانا کی اس تجویز کا مِلا جُلا ردِ عمل ہوا۔ دل نے کہا کہ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک صورت پیدا کر دی ہے، تو اس سے محظوظ ہو جاؤ، دماغ نے کہا کہ اپنی بے بضاعتی اور بے سروسامانی کا بھی کچھ خیال کرو، کہاں جاؤ گے اور کس مُنہ سے جاؤ گے؟ مولانا کا اِصرار اور دل کا اِرشاد غالب ہوا، اور میں اُن کے ساتھ چلا، مگر جوں جوں ہاؤس بوٹ قریب ہوتا جاتا تھا، میرے پاؤں بوجھل ہوتے جاتے تھے، آخر کار ہم وہاں پہنچے اور مولانا نے اپنی اطلاع کرا دی۔ تھوڑی دیر

میں ہمیں اندر بُلایا گیا، مولانا نشاط کی طرف مُنہ کر کے ایک کُرسی پر بیٹھے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے، ہم اندر آئے تو آپ نے لکھنا بند کیا اور ہماری طرف مُتوجہ ہوئے، براّق سفید کھدر کا قمیص اور پاجامہ زیب تن تھا اور پاؤں میں حسین و جمیل سادہ صاف شفاف چپل، سرننگا تھا اور بال سفید، پہلی نظر میں مجھے ایسا لگا کہ میرے سامنے ایک شمع فروزاں ہے جو اپنی جوت سے سارے ماحول کو منور کر رہی ہے۔ ہاؤس بوٹ کا کمرہ بڑے قرینے سے سجا ہوا تھا، مولانا مسعودی نے میرا تعارف کرادیا اور میری ذات کے متعلق کچھ کہتے وقت بہت اسراف سے کام لیا، خاص کر جب انھوں نے کہا کہ یہ کشمیر کے بہت بڑے شاعر ہیں تو میں شرابور ہو گیا، اللہ کا فضل یہ ہوا کہ مولانا مرحوم نے مُسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا، لیکن مجھے امتحان میں نہ ڈالا، نہیں تو مولانا مسعودی نے مجھے بے وُقعت کرنے میں کوئی کمی نہیں فرمائی تھی، باتوں کا سلسلہ دو مولاناؤں کے درمیان شروع ہوا اور میں نقش بہ دیوار سُنتا رہا، موضوع حضرت بل کا مدرسہ مدینۃ العلوم تھا جس کے متعلق مولانا مسعودی حضرت مولانا مرحوم سے کچھ ہدایات حاصِل کرنا چاہتے تھے، اس کے جواب میں مولانا مرحوم نے ایک عظیم علمی تقریر فرمائی جس کا خلاصہ مجھے اب بھی یاد ہے جو یہ تھا کہ ہمارے مکاتب کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں زبانیں علم سمجھ کر پڑھائی جاتی ہیں، حالانکہ زبان علم نہیں، حصولِ علم کا ذریعہ ہے، طالب علموں کی ساری عمر زبان سیکھنے اور اس کا صرف و نحو جاننے میں صرف ہوتی ہے اور وہ بھی زبان کے حصول کو حصولِ علم سمجھتے ہیں،

مجھے یاد ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی اس تقریر میں خاص طور پر علامہ تفتازانی کا نام لیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس بدعت کے موجد وہی ہیں اور بعد میں آنے والوں نے اُن کے طریق کار کو حرزِ جان سمجھ کر سینے سے لگائے رکھا، تعلیم کے بنیادی اصولوں کی بات چلی، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ مادری زبان میں تعلیم دینے کے دو فائدے بالکل نمایاں ہیں۔ اول یہ کہ حصولِ علم کے قابلِ بننے کے لئے کسی غیر زبان کو سیکھنے کے سلسلے میں وقت اور صلاحیت ضائع نہیں ہو جاتی، دوسرے یہ کہ مادری زبان میں جو بات سکھائی جائے وہ نقش برسنگ ہو جاتی ہے۔ مولانا مرحوم نے مولانا محمد سعید صاحب مسعودی کو مشورہ دیا تھا کہ مدینۃ العلوم کا نصاب کچھ اس طرح ترتیب دیا جائے کہ اس میں تعلیم حاصل کرنے والے لوگ بالغ نظر مسلمان اور عصری تقاضوں کے مطابق شناسائے راز ہوں، اس محفل میں بات زیادہ تر تعلیم، نصاب تعلیم اور مقصد تعلیم کے متعلق ہوتی رہی، ادب یا کسی دوسرے موضوع پر بات نہیں ہوئی مگر دورانِ گفتگو مجھے اب یاد نہیں کہ کس تسلسل سے مولانا مرحوم نے کہا کہ ایک فارسی کا نسخہ ہے جس کا نام ہے "مے باید شنید" اُس کے دو شعر بھی آپ نے پڑھے جو مجھے اس وقت یاد رہے اور میں نے آکر محفوظ کر لئے۔ وہ شعر یہ ہیں:

ماراچہ بحالِ بندہ او باگریہ او بخندہ او
مائیم بحالِ خُود گرفتار ماراچہ بحال دیگران کار

یہ نسخہ مجھے 1952ء میں پنڈت تارا چند ترسل سے پڑھنے کو ملا، کسی محمد

علی کا لکھا ہوا ہے اور اس میں بڑے بڑے قیمتی مقولے درج ہیں۔

گھنٹہ بھر تک ہم وہاں رہے، مولانا مرحوم بولتے رہے اور میں اُن کے انداز گُفتار اور علم ناپیدا کنار سے مسحور تھا، مولانا مسعودی بیچ بیچ میں بولتے رہے مگر میں نقش بدیوار تھا اور چاہتا تھا کہ یہ لمحے ابد تک جاری رہیں، جب ہم ہوس بوٹ سے نکلے تو میں حیران و ششدر تھا، اب ہم خانقاہ میں جارہے تھے جہاں جمعہ کی نماز ادا کرنا مقصود تھا۔ اس نماز کی خصوصیت یہ تھی کہ مولانا مرحوم نے جمعہ کا خطبہ دینے اور نماز پڑھانے پر آمادگی ظاہر فرمائی تھی۔ عین وقت پر مولانا تشریف لائے، اب وہ شِروانی میں ملبوس تھے اور خاکی ٹسر کا عمامہ سر پر باندھے ہوئے تھے۔ اُس کا ایک سراگردن کے گرد لپٹا ہوا تھا، رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور مولانا نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس کا ماحصل یہ تھا:

"میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں، تمہارے چہروں پر روزہ رمضان ہے تمہارے خشک ہونٹوں پر روزہ بول رہا ہے اور تمہاری آنکھوں میں روزوں کا نُور ہے۔ خدا کرے تمہارے یہ روزے قبول ہوں، ان میں اخلاص اور لِلٰہیّت ہو، اور ان سے تم اپنے نفس کا تزکیہ کرسکو، ایک صحیح حدیث ہے، ایک روز رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابیوں سے پوچھا مَنِ المفلسِ ، یعنی مُفلِس کون ہے؟ قال قائل : من لا مالَ له ، ایک صاحب نے کہا مُفلِس وہ ہے جس کے پاس مالِ دنیا نہ ہو، حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دِن فرشتے ایک آدمی کو بارگاہِ رب العزت میں پیش کریں گے اس آدمی کے ساتھ اور تین آدمی ہوں گے اور

تین گٹھڑیاں، فرشتے عرض کریں گے بارِ الٰہا، یہ ایک آدمی ہے اور اس کا سرمایہ یہ تین گٹھڑیاں ہیں۔

اس میں اس کی نماز ہے، اس میں اس کا روزہ ہے اور اس میں اس کی زکواۃ ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ تین آدمی بھی ہیں۔

ایک کو تو اُس نے پٹیا ہے، دوسرے کو گالی دی ہے اور تیسرے کا مال کھایا ہے، فقال رسول اللّٰہ ﷺ هو المفلس، اس کے بعد رسُولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی شخص مُفلِس ہے خُدا کرے کہ ہم سب اس قسم کے افلاس اور اس ناداری سے نجات پا جائیں۔"

خطبہ کے دوران کچھ لوگ جیسا کہ ہماری عادت ہے آپس میں بول رہے تھے۔ مولانا نے فرمایا:

"خطبہ نماز کا حصّہ ہے اور جس طرح نماز میں بولنا ممنوع ہے اسی طرح خطبہ میں بولنا بھی ناجائز ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ دورانِ خطبہ اگر کوئی شخص باتیں کرنے لگے اور دوسرا آدمی اُسے ایسا کرنے سے منع کرے تو نہ صرف باتیں کرنے والے نے بلکہ اسے منع کرنے والے نے بھی بیہودگی کی فقد لغی ومن لغی فلا جمعةَ له اور جس نے بیہودگی کی اُس کی جمعہ کی نماز فاسد ہوگئی۔"

میں یہ سب کچھ اپنے حافظے کی مدد سے لکھ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ میری فروگذاشتوں کو مُعاف فرمائے۔ نماز آپ نے پڑھائی اور پہلی رکعت میں سبّح اسم ربّك الأعلى پڑھا، مجھے آج تک وہ نماز یاد ہے۔ وہ سجدہ یاد ہے جو میں نے

اس مردِ درویش کی اِقتدا میں دیا تھا اور یہ یاد اب تک دل کو سوز و گداز کے علاوہ ایک (حلاوت) بھی عطا کرتی ہے، کئی روز سے یہ واقعہ ذہن میں گھوم رہا تھا آج بے اختیار ہو کر اسے کاغذ پر محفوظ کر دیا:

نوائے بادبد ماند است دوستاں

☆☆☆

اورنگ زیب عالمگیر

ہندوستان کا یہ جلیل القدر شہنشاہ مدتِ دراز سے متنازعہ فیہ شخصیت کا مالک ہے۔ اورنگ زیب کے ماننے والے اُسے غیر معمولی روحانی اور وجدانی طاقتوں کا مالک سمجھتے ہیں اور اُن کی وہی عزت کرتے ہیں جو عظیم المرتبت اولیاء اور اتقیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ لوگ، جو اورنگ زیب کو اچھا نہیں سمجھتے، اُس کی ذات کو تمام عیوب و نقائص کا مجموعہ خیال کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں اورنگ زیب نہایت تنگ نظر اور بر خُود غلط قسم کا انسان تھا۔ اورنگ زیب کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مظلوم ہے۔ جو لوگ اُسے روحانی پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہیں، وہ بھی ظالم ہیں اور جو اُسے ایک سخت گیر اور متعصّب مُسلمان سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ظالم ہیں۔ اورنگ زیب ایک بہادُر جرنیل، زبردست سیاست دان اور اعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت کا بادشاہ

تھا۔ جس کی نظر سے ممالک محرؤسہ کی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی پوشیدہ نہ تھی، اُس کی نجی زندگی بھی مجموعہ اضداد تھی۔ جہاں اُس نے اپنے معزّز و محترم باپ کو معزول کر کے نظر بند کیا اور بھائیوں کو ہلاکت کا جام پلایا، وہاں وہ بڑا سیر چشم، فیاض، خُدا دوست اور خطا پوش بھی تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اتنی بڑی سلطنت کو چلانے کے لئے جس فردِ واحد کو اللہ نے منتخب فرمایا تھا، وہ جہانبانی اور بندہ پروری کے تمام آداب سے واقف تھا۔ اورنگ زیب کی سیاسی بصیرت اور دُور اندیشی کے واقعات کو ہم آج بھی پڑھتے ہیں تو ماننا پڑتا ہے کہ عصر حاضر کے فرمان روایاں بھی اگر اسی بصیرت اور عاقبت اندیشی سے کام لیں تو بڑی بڑی مصیبتں دوُر ہوسکتی ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے چند واقعات درج ہیں۔

مرنے سے پہلے اورنگ زیب نے بارہ وصیتیں کیں۔ وصیت 9 یہ ہے:

"باسادات لازم ولسعاداتِ بارہہ بموجب آیہ" واتِ ذی القربی حقه، عمل باید نمود، در احترام ورعایت فروگذاشت بناہد کرو۔ ازیں راہ کہ بموجب آیہ کریمہ "قل لا أسالكم عليه أجرا الاّ المودّة فى القربى"۔ محبت امیرِ جماعت اجرنبوت است۔ ہرگز مقصد نباہد بود۔ کہ متمر دُنیا و آخرت است لیکن بادسادات بارہہ کمال احتیاط باہد نمود۔ درمحبت ماضی قصؤر نباہد کرو۔ وبحسبِ ظاہر مرتبہ ایں ہانباہد افزود کہ شریک غالب بلکہ طالب مُلک افروز۔ اگر اندک استرخائے عنال شود، ندامت خواہد شد۔"

یعنی سادات بارہہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ شاہی

خاندان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ان کا احترام کرنا چاہئے اور تمام مناسب سہولتیں عطا کرنی چاہیں۔ یہ لوگ رسولؐ کی اولاد ہیں اور حکمِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا نبوّت کا اجر ہے جو مسلمانوں پر واجب ہے۔ دِلوں میں بھی ان کی محبت سے دُنیا و آخرت کی نجات مِل سکتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان لوگوں سے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے نمِٹ لینا چاہیے۔ اُن کو زیادہ بڑے عہدوں پر فائز کرنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ شریکِ غالب ہی نہیں بلکہ سلطنت کے جو یا بھی ہیں، ذرا سی کمزوری سے ان کی شرارتیں بڑھ جائیں گی اور نتیجہ ندامت ہو گا۔

اب ذرا اِن سادات عالی درجات کے کارنامے بھی ملاحظہ فرمایئے:

سید حسین اور سید علی سید عبد اللہ بارہہ کے دو صاحبزادے تھے۔ عالم گیر کے زمانے میں یہ دونوں بھائی خانی اور دوسرے مناسب پر سرافراز تھے۔ اورنگ زیب جس زمانے میں مرہٹوں کی سرکوبی میں مصروف تھا، ان دونوں بھائیوں نے بڑی جان فشانی اور شجاعت سے دُشمن کا مقابلہ کر کے بادشاہ کا قرب حاصل کیا۔ سید حسین دکھن میں اعلیٰ عہدوں پر تعینات تھے اور سید علی شاہ زادہ معزالدین کے ساتھ ملتان میں مقیم تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم شاہ بادشاہ ہوئے۔ وہ کابل سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں سید علی اُن سے جا ملے۔ کیونکہ وہ شاہزادہ معزالدین کے ساتھ نباہ نہ کر سکے تھے۔ معظم شاہ نے اُن کے منصب میں ترقی دے کر اُسے اپنے ساتھ لے آئے اور طبل و علم کا اعزاز عطا

کیا۔ پایہ تخت میں اُنھیں فوج کا تجسی مقرر کیا۔ معظم شاہ اور اعظم شاہ میں لڑائی ہوئی تو ان شہ زادوں نے معظم شاہ کی حمایت میں تلوار اُٹھائی اور بادشاہ نے دونوں کی قدر افزائی فرمائی۔ سید حسین پہلے اجمیر اور پھر الہ آباد کے گورنر ہوئے۔ سید علی بہار کے صوبہ دار ہو کر دادِ فرما نروائی دیتے رہے۔ مغل شاہزادوں میں اقتدار کی ہوس زوروں پر تھی۔ جہاندار شاہ کے سقوط کے بعد تخت نشینی کے متعلق پھر رسہ کشی ہوئی۔ اس معاملے میں ان سیّد زادوں نے بڑا اہم حصہ ادا کیا اور فرخ سیر کو تخت نشین بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ خان نصرت جنگ اور اُن کے والد دستور معظم، جو عہد عالم گیری کے ممتاز اربابِ سلطنت تھے۔ ان ہی دو بھائیوں کے ہاتھوں خوار و ذلیل ہو کر قتل ہوئے۔ اس کے بعد ان سید زادوں کی دراز دستیاں بڑھتی گئیں۔ تختِ سلطنت پر ایک بادشاہ آتا اور دوسرا جاتا رہا اور ان سب کے عزل و نصب میں ہاتھ ان ہی سیدزادوں کا تھا۔ جس کو چاہتے، بادشاہ بناتے۔ جس کو چاہتے اُٹھا کر پھینک دیتے۔ جب ان کی سرگرمیاں بہت تیز ہوئیں تو میر حیدر خان نے سید علی کو قتل کرا دیا۔ سید عبداللہ خان نے جنگ کی۔ شکست کھائی اور قید خانے میں مرا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال میں جتنا ہاتھ ان سیّدوں کا ہے، اتنا کسی کا نہیں۔ عالم گیر اس راز سے واقف تھا اور وصایا میں واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ان کی دل جوئی، عزت و احترام اور مالی مدد ضرور کرنی چاہیے مگر امورِ سلطنت میں ان کو دخل اندازی کرنے کی ہرگز اجازت نہ دینی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ لوگ جاہ پسند اور طبعاً فتنہ پرور ہیں۔

وصایا سے پہلے کا ایک اور واقعہ بھی ہے۔ ذوالفقار خان بہادُر نصرت جنگ نے (جو بعد میں ان ہی سادات کے ہاتھوں تباہ و برباد اور آخر میں قتل ہوئے) اورنگ زیب کو لِکھا کہ ان دونوں بھائیوں نے مرہٹوں کے ساتھ جنگ میں بڑی جان فشانی کی ہے۔ اس لئے اُنھیں کچھ نقد معاونت کے علاوہ اعلیٰ مناصب بھی دئے جائیں۔ بادشاہ نے لکھا:

"نقد معاونت کے سلسلے میں آپ کی تجویز بر وقت اور برمحل ہے۔ ساداتِ رفیع الدرجات کے ساتھ محبت رکھنا عینِ عرفان ہے اور ان کے ساتھ دُشمنی جہنم کے عذاب کا باعث اور اللہ تعالیٰ کے قہر کا سبب بنتی ہے۔ لیکن ان کو اعلیٰ منصبوں پر فائز کرنے کی تجویز کو تسلیم کر لینا مشکل ہے۔ امور سلطنت کی باگ ڈور ساداتِ بارہہ کے ہاتھ میں دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے بدانجام کو دعوت دے رہا ہے میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ ان کی تھوڑی سی قدر افزائی کرو تو دماغ بگڑ جاتا ہے اور انقلاب پیدا کرنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ایسا کام نہ کرنا چاہیے جس کا انجام پشیمانی کا باعث ہو۔

آدمی اورنگ زیب کی سیاسی بصیرت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ سیادت کے اعتبار سے وہ ان کی قدر کرتا ہے۔ ان کی ضرورتیں پُوری کرتا ہے۔ انھیں عزّت و آبرو سے رہنے کے اسباب تلاش کرتا ہے۔ مگر سیاسی امور میں پاس تک پھٹکنے نہیں دیتا۔ کیوں کہ اُن سے فساد کی بُو آتی ہے۔ وصیّت میں بھی اس کا صریحی ذکر کرتا ہے۔ بعد میں آنے والے اس پر عمل نہیں کرتے اور روزِبد دیکھ

لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کی نظر عقاب کی نظر تھی اور وہ مردم شناسی میں لاثانی تھا۔ اس سے پہلے تذکرہ ہوا ہے کہ سید علی، شاہزادہ معزالدین کے ساتھ تھے۔ اُن کی آپس میں نہ بنی۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو یہ حکم نافذ فرمایا:

"حسن علی خان بافرزند زادہ بہادُر محمد معزالدین برہم زدگی نمود و بے اجازت برخاستہ آمد۔ چنانچہ شاہزادہ گلۂ اونوشتہ کمی نصب باید کرد و جاگیر ضبط نمؤدتا دیگراں راعبرت شود۔"

یعنے "حسن علی خان نے فرزند زادہ محمد معزالدین کے ساتھ بدتمیزی کی ہے اور بلا اجازت وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا ہے۔ شاہزادے نے شکایت کی ہے کہ حسن علی خان کا عہدہ گھٹا دیا جائے اور جاگیر ضبط کر دی جائے تا کہ اوروں کو عبرت ہو۔"

سرکاری امور کو چلانے کے لئے ڈسپلن (نظم و ضبط) کی کتنی ضرورت ہے، اس کا اندازہ انتظامیہ چلانے والوں کو ہے اور پھر بتایئے ڈسپلن کی اس سے زیادہ کوئی اور مثال ہوسکتی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد معظم شاہ بادشاہ ہوا تو سب سے پہلے اسی سیّد علی کو اپنے ہمراہ لے آیا اور اسے بہت بڑے منصب پر فائز کر کے جہاں ایک طرف اپنے عظیم باپ کی نافرمانی کی وہاں سلطنتِ مغلیہ کے مستقل زوال کی سنگِ بُنیاد بھی ڈال دی۔

چین اور ہندوستان میں ابتداء بڑے گہرے تعلقات تھے اور "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعروں سے فضا معمؤر رہتی تھی۔ اِدھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر چین

اپنے ممالک کی سرحدوں میں اضافے کی سوچ رہا تھا اور ہندوستانی زعماء کو اپنی دوستی کا یقین دلاتے ہوئے اقصائے چین میں سڑکوں کی تعمیر میں مصروف تھا۔ ہندوستان کو جب پتہ لگا کہ چین نے ہندوستان کے ہزاروں مربع میل علاقے پر قبضہ جما لیا تھا۔ یہ صورت حال سخت فِکر انگیز تھی اور سارے مُلک میں اس کا زبردست ردِعمل ہوا۔ جواہر لال نہرو کو اپنی ناکامی کے احساس نے شرمندہ کر دیا اور آخر کار پارلیمنٹ میں اعلان کرنا ہی پڑا کہ چین نے وشواس گھات کر کے ہمارے ہزاروں مربع میل پر قبضہ کر لیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اپنی خفتِ مِٹانے کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ وہ ریگستانی علاقہ ہے اور اس سے گھاس کا ایک تنکہ بھی نہیں اُگتا۔ اس پر پارلیمنٹ کے ایک ذہین ممبر شری مہابیر تیاگی اُٹھ کھڑے ہوئے، اپنے سر سے ٹوپی اُٹھائی اور سارے ایوان کو اپنے سر کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولے۔ صاحبان! میرے سر پر بالوں کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا۔ میں گنجا ہوں۔ کیا میں اوروں کو اجازت دوں کہ وہ آئیں اور میرے سر پر قبضہ جما لیں...... یہ واقعہ مجھے اورنگ زیب کے اس خط سے یاد آیا۔ خط کی شانِ نزول یہ ہے کہ امیر خان صوبے دار کابل نے عرضداشت میں لکھا تھا کہ تھانے دار ایران، ہندوستانی سرحد پر ہندوستانی علاقے سے صرف دو کوس زمین مانگتا ہے تا کہ وہ اس پر اپنی چوکی قائم کر سکے۔ اس کے عوض وہ ہندوستان کو ہر سال سَو عربی گھوڑے دیتا رہے گا۔ حکم ہوا:

"تھانہ دار ایران را بہ آب ورنگ آوردن و صوبہ داری خودر اے آبرو

ساختن کارِ عقلانیست۔ لیکن ...... طمع راسہ حرف است ہرسہ تہی۔ دوکر وہ ایں طرف رخصت دادن چہ معنی کہ دو قدم رخصت نیست۔ مسئلہ فقہی درہمہ مذہب سند است کہ اجرابر صنعایر عین کبایر است۔ عجب است ازاں خانہ زاد مزاج داں کہ ازسنِ ہفت سنگی درحضور تربیت شدہ از تدبیر ایرانیاں غافل است خود تصور کُند کہ برائے ایں کارِ سہل کہ دوکردہ ایں طرف نشانیدن تھانہ باشد۔ چگونہ بصد اسپ عراقی کہ قیمتِ آں عمدہ شود راضی شُدہ اند؟

ہماں مثل است:

سرانگشت گیرد بفکرِ شکست بیک بارحرکت نماید بدست
تُو از فکرِ دُشمن بہ غفلت مباش ہمیشہ رُخ تیرہ اش راخروش

مثل مشہور است کہ عقل و دولت قرین یک دگراند۔ ہرکہ راعقل نیست۔ دولت نیست۔ عوام کا الانجام فہمیدہ اند کہ ہرکہ دولت مند باشد البتہ باید عاقل باشد واین غلط است۔ معنی آنست کہ ہرکہ عقل راندارداو پایدارنیست۔ طول کلام دریں مقام آہنِ سرد کوفتن و جامئہ کہنہ دوختن است۔"

یعنے ایران کے تھانے دار کو عزّت بخشنا اور اپنی صوبہ داری کو بے آبرؤ کرنا داناؤں کا کام نہیں۔ ہم نے طمع کی وجہ سے ایسا لِکھا ہے اور طمع کے تینوں حروف خالی یعنے بے نقطہ ہیں۔ دوکوس ادھر آنے کی اجازت تو کیا ہو گی، دو قدم آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ تمام مذاہب میں فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں پر مداومت کرنا گُناہِ کبیرہ (بڑا گناہ)) بن جاتا ہے۔ تُم

سات سال کی عمر سے ہمارے ہاں پلے بڑھے اور تربیت پاتے رہے۔ ہمارے مزاج سے واقف ہو اور تعجب ہے کہ ایرانیوں کی تیاری سے بے نیاز بیٹھے ہو۔ ذرا سوچا ہوتا کہ دوکوس ہمارے علاقے میں آنے کا مطلب کیا ہے اور ایرانی اس بظاہر معمولی سی رعایت کے لئے ہر سال سَو عربی یا عراقی گھوڑے دینے پر رضامند کیوں ہیں؟ افسوس ہے! مثال برابر وہی ہے کہ دُشمن سب سے پہلے اُنگلی کا سِرا پکڑتا ہے تاکہ سارے ہاتھ پر قبضہ کر سکے۔ مشہور مثال ہے کہ دولت اور عقل ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ جس کے پاس عقل نہیں، دولت نہیں۔ جاہل عوام سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو دولت مند ہو گا وہ خواہ مخواہ دانا بھی ہوگا۔ مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کے پاس عقل نہیں، دولت اُس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی! زیادہ لِکھنا تو ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا اور پھٹے ہوئے کپڑے کو دوبارہ سی لینے کے مترادف ہے۔"

کارِ جہانبانی کرنے والوں اور انتظامیہ امور چلانے والوں کے لئے اس فرمان سے زیادہ وقیع میرے خیال میں کوئی بائبل نہیں ہوسکتی۔ میرا بس چلتا تو میں اورنگ زیب کے اس فرمان کو جلّی حروف میں لکھوا کر اور ہندوستان کی تمام زبانوں میں ترجمہ کروا کر ہندوستان کی پارلمینٹ میں نمایاں مقامات پر آویزاں کروا لیتا۔ مگر کیا کِیا جائے یہ حرفِ حق اورنگ زیب کی زبان سے نِکلا ہے جس کے نام سے ہندوستان کی اکثریت بِدک اٹھتی ہے اور نہ معلوم اُسے کون کون سے خطابات دیتی ہے کہ وہ ہندو کُش تھا۔ لوگوں کو جبراً مسلمان بناتا تھا، تنگ نظر تھا،

فرقہ پرست تھا، مُلا تھا اور کیا نہ تھا۔ ذرا اس کا جائزہ ہم آنے والے صفحات میں لیں۔

ایڈمنسٹریشن میں لوگوں کی دخل درمعقولات ایک ایسی وباء ہے جس کا سامنا ہم گذشتہ بائیس برس سے کر رہے ہیں۔ کوئی کام خاطر خواہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ ارباب فرض کام کرنے نہیں دیتے۔ لوگوں کے لئے کام تلاش کئے جاتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں کاموں کے لئے لوگوں کو تلاش کیا جاتا تھا، اورنگ زیب کا ایک واقعہ ہے۔ ایک صاحب تھے سیّد سعد اللہ، جو بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ سالک، صوفی اور حد درجہ کے خُدا دوست بُزرگ تھے۔ اورنگ زیب کو ان کا بڑا پاس تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی خلوتِ خاص میں سوائے سید سعد اللہ کے اور کسی کو باریابی نہ تھی۔ ایک دفعہ ان ہی سیّد صاحب نے ایک افسر کی تبدیلی اور ایک آدمی کی تعیناتی کے لئے سفارشی خط لِکھا۔ سیّد صاحب کو تو کوئی جواب نہ دیا، البتہ اپنے مشیر اعلٰے کو لِکھا:

"سیّد سعد اللہ مکرّر خطوط ہما فرستادہ، اظہار چیز ہائے بسیار نمودہ کہ سوانح نگار سوُرت بندر راتغیرّ باید کرد۔ وخلفِ حکیم اشرف متوفی خدمتِ دارالشفا نمودہ بہ اضافۂ یومیہ قوت دِل بخشید۔ باید نوشت کہ بعد ازیں در مقدماتِ اہلِ خدمات دخل نمودہ باشند۔"

مطلب یہ کہ سید سعد اللہ نے ان ہی دنوں ہمارے نام بہت سے خط لکھے ہیں۔ اور بہت سی خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں یہ بھی ہے کہ سوانح

نگار سورت بندر کو تبدیل کیا جائے اور حکیم اشرف مرحوم کی جگہ اُن کے بیٹے کو شفاخانے کا انچارج بنا دیا جائے اور اُن کے الاؤنس میں اضافہ کر دیا جائے۔ سیّد سعد اللہ کو لکھ دیا جائے کہ وہ آج کے بعد سرکاری اہل کاروں کے معاملے میں دخل نہ دیا کریں!"

سُبحان اللہ ! کیا دوٹوک جواب ہے۔ ایک طرف عالم یہ ہے کہ بادشاہ اُن کے علم اور تقویٰ کی بنا پر اُن کی جوتیاں بھی سیدھی کرتے ہیں۔ اور وہ جب چاہیں باریابی حاصل کر سکتے ہیں۔ خلوتِ خانۂ خاص میں بھی اُن کی آمد پر کوئی پابندی نہیں اور دوسری طرف حالت یہ کہ وہ دو اہل کاروں کی سفارش کرتے ہیں تو اُن کے دانت توڑ دِیئے جاتے ہیں اور ایسا جواب دیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ جمہوریت کے فوائد جو بھی ہوں مگر یہ کیا کم نقصان ہے کہ حلقہ پریزیڈنٹوں کی دخل در معقولات نے سارے مُلک کے انتظامیہ کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ نا اہلوں کے پوبارہ ہیں۔اور مستحق دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ انصاف کے ترازؤ میں بل پڑ گئے ہیں اور ہر وہ شخص دندنا پھرتا ہے جسے تھوڑا سا اثر و رسُوخ حاصل ہے۔ اورنگ زیب کے سامنے بارسوخ اگر کوئی شخص تھا صرف سیّد سعد اللہ تھا۔ اس کی جو حالت اس جواب سے ہوئی ہو گی، اُس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں!

اپنے بیٹے کام بخش سے اورنگ زیب سخت محبت کرتے تھے۔ ایک جنگ میں حریف سے جا مِلا۔ کیونکہ انھوں نے اُسے بادشاہ بننے کا خواب دِکھایا۔ آخر

ناکام ہوا اور بادشاہ کے سامنے حاضر کر دیا گیا۔ تمام ذاتی محبت کو بالائے طاق رکھ کر اُسے قید کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد کام بخش کے پاس کچھ اوراد و ظائف لِکھ بھیجے اور فرمایا، ان کا وِرد کیا کرو۔ اس کے پڑھنے سے زندان سے رہائی مِلتی ہے۔ ایک مصاحب نے عرض کی کہ رہائی تو عالم پناہ کے ہاتھ میں ہے۔ فرمایا۔ نہیں میرے دِل کے ہاتھ میں ہے اور وہ کام بخش کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ اور اوراد و ظائف کا فائدہ یہی ہوگا کہ ہمارا دِل اس کی طرف سے صاف ہو گا۔ ایک اور خط میں لکھا:

"بہدایت اللہ خان زریں رقم گویند کہ ایں رباعی کہ بہ بادشاہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بہ خط خود بنویسّند۔

آتش بہ دو دستِ خویش درخرمنِ خویش
من خود زدہ ام چہ نالم از دُشمنِ خویش
کس دُشمن من نیست و منم دُشمنِ خویش
اے واے من ودستِ من و دامنِ خویش!

(ہدایت اللہ خان زرّیں رقم سے کہیں کہ وہ اپنے قلم سے یہ رباعی اُس بیاض میں لِکھے جو شاہزادہ کام بخشِ کے لئے ہے۔ رُباعی کا مفہوم یہ ہے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کھلیان میں آگ لگا دی۔ دُشمن کا کیا گِلہ کروں۔ یہ کام تو میں نے خود کیا ہے، میرا کوئی دشمن نہیں۔ میں خُود اپنا دُشمن ہوں۔ افسوس میرے حال پر میرے ہاتھوں پر اور میرے دامن پر۔)

(اس سے پہلے دوسرے بیٹے شاہزادہ محمد سلطان نے شاہ شجاع کے ساتھ سازوباز کی تھی۔ شجاع کی شکست کے بعد شاہزادہ قید ہوا اور وہیں مر گیا۔ مرتے وقت اُس کی عمر صرف تیس سال تھی۔)

عالم گیری دربار کے امرا میں سے خان فیروز جنگ بادشاہ کا سب سے زیادہ چہیتا تھا۔ میر شہاب الدین نام تھا اور محض اپنی قابلیت کی بنا پر بادشاہ کا خاص الخاص آدمی بنا تھا۔ فیروز جنگ پر طاعون کا حملہ ہوا۔ جان تو بچ گئی مگر سماعت اور بصارت کھو بیٹھے۔ طبیبوں نے انگور کھانے سے منع کیا تھا۔ بادشاہ کو فیروز جنگ سے والہانہ محبت تھی۔ اس حال میں اُن کی عیادت کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے۔ لِکھا:

"می خواستم برائے عیادت آن دولت خواہ خوُد بیالم، اما بچہ رو و کدام نظر مشاہدہ نمائیم۔ لہذا سعادت خان رانیابتۂ فرستادیم، تابچشم مابیند و اظہار مافی الضمیر کُند۔ ازمیوہ ہاے سوزس آنچہ اینجا بہم می رسد انگور است، اما اطبائے یونان برائے آن عمدۂ مخلصان مزاج داں مُضر می گویند۔ لہذا برخود ہم ناگوار کردیم۔ انشا اللہ تقدّس بعدِ صحت کامِل وشفائے عاجل یک جا می خوریم......"

یعنی ہم خود عیادت کے لئے آنا چاہتے تھے مگر کِس مُنہ اور کِس نظر سے آپ کا حال دیکھیں۔ لہذا اپنی طرف سے سعادت خان کو بھیج رہا ہوں جو ہماری آنکھ سے دیکھے گا اور ہمارے دِل کی بات بتا دے گا۔ آج کل یہاں صرف انگور مِلتا ہے۔ طبیبوں نے اسے آپ کے لئے مُضر کہا ہے۔ اس لئے ہم نے

بھی اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے۔ انشاء اللہ آپ تندرُست ہو جائیں گے تو اکھٹے کھائیں گے!"

اس واقعہ سے بادشاہ کے اُس تعلقِ خاطر کا اندازہ ہوتا ہے جو اُنھیں فیروز جنگ کے ساتھ تھا۔ اسی فیروز جنگ کے متعلق وقائع نگار نے اطلاع دی کہ انھوں نے ایک شخص مسمی محمد عاقل کو رہزنی کے جُرم کی پاداش میں قتل کرادیا۔ فوراً حکم ہوا۔

"عمدۃ الملک مدار المہام بہ فیروز جنگ بے افرنگ نبویسد کہ بر قتل کہ عبارت از ہدم بنیاں الٰہی دست، بغیر از حُجت شرعی اقدام نمودہ، وائے براں روز کہ وارث بہم رسد و دیت نہ کُند این نحیف رابغیر از حکُم قصاص چہ چارہ کہ ترحم درحدد ممنوع نص کلام اللہ است۔"

(عمدۃ الملک مدار المہام کم عقل فیروز جنگ کو لکھے، اُس نے قتل کر کے اللہ تعالےٰ کی بنائی ہوئی تعمیر کو منہدم کر دیا ہے۔ جس کے لئے اُس کے پاس کوئی شرعی جواز نہیں۔ وہ دِن بڑا افسوس ناک ہو گا جب مقتول کا وارث آ جائے گا۔ خون بہا لینے سے انکار کرے گا۔ اس بندۂ عاجز کے لئے کوئی چارہ نہ ہو گا کہ فیروز جنگ کے خلاف قصاص کا حکُم نافذ کر دے۔ کیونکہ بے جا رحم احکام الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔)

اندازہ فرمایئے خان فیروز جنگ کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اُس کے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ہوں گے!

شہزادہ محمد اعظم نے دربار میں ایک دن کوئی چیز طلب کی۔ درخواست نامنظور ہوئی۔ شاہزادہ کی سخت توہین ہوئی اور اُٹھ کر ناراضگی کے عالم میں جانے لگے۔ جاتے جاتے پاؤں شاہی مسند پر پڑا۔ دربار میں آنا بند کر دیا گیا۔ کچھ مدّت کے بعد شاہ سلیم اللہ نے سفارش کی اور کہا کہ شہزادہ سے بھُول ہوئی ہے۔ اُس سے درگزر فرمایا جائے۔ درخواست پر یہ شعر لِکھا:

از ساحل نجات بہ بحر فنا فتاد
از حد خُود کسے کہ قدم پیشتر گداست

(جس شخص نے اپنی حدوُد سے تجاوز کر کے ایک قدم بھی آگے بڑھایا، وہ ساحلِ نجات سے الگ ہو کر فنا کے سمندر میں غرق ہوا)

یہ تھی تادیب اور یہ تھا نظم وضبط کا عالم۔ اور اس میں اپنے پرائے، ہندو مسلمان خویش وغیرہ، کسی کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اور یہی چیز ایک مضبوُط اور اعلیٰ انتظامیہ کے لئے بے حد ضروری ہے۔

اس سے یہ خیال نہ کیجئے کہ اورنگ زیب صرف تادیب ہی تادیب تھا۔ تادیب کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نوازشوں اور کرم فرمائیوں میں بھی بے نظیر تھا۔ جہاں کسی نے کوئی اچھا کام کیا۔ فوراً نہ صرف یہ کہ اس کا اعترافِ کیا بلکہ اچھا کام کرنے والے کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ مدار المہام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آں فدوی از نصرت جنگ پرسیدہ بطلبد کہ نگین زمُرد بہ اومرحمت مے شود لیکن بہ تمام خطاب وفانمی کُند۔ اگر بگوید نصرت جنگ فقط کندہ آید۔ ومنقش

کردہ عنایت کنیم۔"

(نصرت جنگ کو بُلا کر اُس سے پوچھ لیجئے کہ ہم اُسے ایک زمرّد کا نگینہ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اُس پر اُن کے سارے القاب سمانہیں سکتے۔ اگر وہ چاہیں تو صرف نصرت جنگ کندہ کروا کے اُن کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ شعر بھی لِکھا ہے:

دانی کہ برنگینِ سلیمان چہ نقش بُود
خطے بزر نوشتہ کہ ایں نیز بگرزد

(جانتے ہو سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کے نگینے پر کیا لکھا تھا؟ سونے کے حروف میں لکھا تھا کہ یہ بھی نہیں رہے گا!)

فیروز جنگ کا ذکر اس سے پہلے ہوا ہے۔ ان ہی کے نام ایک لطیف خط یہ ہے۔

خان فیروز جنگ یک رنگِ من
الحمد للہ دوُری قلب نیست
گر دریمنی بامنی پیش منی
در پیشِ منی بے منی دریمنی

(خُدا کا شُکر ہے کہ آنکھوں سے دُور ہو کر بھی دِل سے دوُر نہیں ہو۔ یمن میں بھی رہو، میرا خیال ساتھ رہے تو میرے پاس ہو۔ میرے پاس بھی رہو، میرا خیال ساتھ نہ ہو، تو یہاں نہیں، یمن میں ہو۔)

اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں:

"آنچہ معلوم می شود، مصطفیٰ قلی بیگ دیوانِ خاص آں فرزند کار ہا بجز رسی انجام می دہد۔ غنیمت است، اضافہ منصب وفائی اگر بنویسند دادہ آید۔ آدم خوب مثل طلائے بے غش است۔"

(معلوم ہوتا ہے آپ کا دیوان خاص مصطفیٰ قلی بیگ کام بڑی ہوشیاری اور سوجھ بوجھ سے انجام دے رہا ہے۔ غنیمت ہے اگر آپ تجویز کریں تو اُس کا عہدہ اور خطاب بڑھا دیا جا سکتا ہے۔ اچھا آدمی کھرے سونے کی طرح (نایاب) ہے!)

وقائع نگار نے لِکھا کہ ایک امیر میر حبیب اللہ نے سرکاری خزانے کا سارا روپیہ خرچ کر ڈالا ہے اور اُس کے افسر عنایت اللہ خان نے میر حبیب اللہ سے سخت بازپُرس کی ہے۔ میر نے اقرارِ جرم بھی کیا ہے اور اب عنایت اللہ خان نے زبردست سرکاری افسر اُس کے پیچھے لگا دئے ہیں کہ خرد بُرد کیا ہوا روپیہ وصول کریں۔ مگر میر حبیب اللہ کے پاس کچھ نہیں۔ عنایت اللہ خان کے نام حکم صادر ہوا:

"زرِ وصل شدہ را باز سعی چرا باید کرد؟ قبل ازیں از سوانح بُرہان پور مکرّر بعرض رسیدہ بُود کہ سید مسطور ہر چہ بہم میر ساند بہ اربابِ استحقاق و مصارف خیر صرف می کند۔ ہرگاہ از مال ایں عاصی غرقِ معاصی ہم بہ نیابت بمصرف خیر رسیدہ باشد، اعادہ بے فایدہ است۔"

(ہاتھ سے گئے ہوئے مال کو واپس لانے کی کوشش کیوں کی جائے۔

ہمیں اس سے پہلے بُرہان پور کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ میر حبیب اللہ کو جو کچھ ملتا ہے وہ محتاجوں کو دیتا ہے اور نیکی کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس گُنہگار کے مال سے بھی اگر اُس نے نیابتہً نیکی کی راہوں میں خرچ کیا ہو، تو اس کا واپس وصول کرنا بے فایدہ ہے!)

ان مثالوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ سخت گیر اورنگ زیب انسان دوست بھی تھا اور جہاں کسی مظلوم کو دیکھتا تو ماہئی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا۔ اپنے فرمانوں اور خطوں میں اورنگ زیب نے اس بات پر سخت تاکید کی ہے کہ خلق اللہ کو تکلیف نہ ہو۔ عوام پر ظُلم نہ ہونے دیا جائے، بداَمنی نہ ہونے پائے اور ہر شخص اطمینان اور سُکھ کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اُس کا اعتقاد تھا کہ اگر سارے مُلک میں ایک انسان کے ساتھ بھی زیادتی یا ظُلم ہو تو وہ اپنے معبود کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اس میں مسلمان، غیر مُسلمان کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اورنگ زیب کے ساتھ سب سے بڑا ظُلم یہی ہوا ہے کہ وہ بڑا تنگ نظر مُسلمان تھا۔ واقعات اس الزام کی تائید نہیں کرتے!

ایک امیر نے ترقی کی درخواست دی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میرے مقابلے میں ایرانی امیر زیادہ بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ حالانکہ وہ بدمذہب ہیں۔ جواب ارشاد ہو:۔

"آنچہ از قدم خدمت خود نوشتہ بیانِ واقع است، بقدرِ مقدوُر قدر دانی بہ عمل می آید۔ و آنچہ از بد مذہب ایرانیاں نوشتہ امورِ دُنیار ابامذہب چہ نسبت؟

وکار ہاے مذہب را بہ تعصب چہ دخل؟ لکمٔہ دینکم ولی دین۔ اگر ہمیں قاعدہ مقرر بودے بایست کہ جمیع راجہ ہا و تبعہ آں ہا ر استاصیل مے کر دیم، اختیار غیر قابلاں نزدِ عقلا مذموم است۔"

(تُم نے اپنی خدمات کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ واقعات پر مبنی ہے۔ حتی الامکان ان خدمات کا صِلہ دیا جائے گا۔ ایرانیوں کی بدمذہبی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ حماقت ہے۔ دُنیوی کاروبار چلانے کو کسی کے مذہب سے کیا سروکار؟ مذہب کو تعصّب کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے، تُمھارا دین تُم کو مُبارک ہو۔ اگر یہی اصول کارفرما ہوتا تو سارے ہندوستان میں جتنے راجے مہاراجے اور اُن کے اہالی موالی، جو برسرِ اقتدار ہیں، ہمارے ہاتھوں سے ختم کر دیئے گئے ہوتے۔ نا قابلوں اور نااہلوں کو بڑے بڑے امور تفویض کرنا داناؤں کے پاس بہت مذمؤم فعل ہے۔)

میرے خیال میں یہ منشور ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی کو یہ کہنے کی جُرات نہ ہونی چاہیئے کہ اورنگ زیب تنگ نظر اور متعصب برخود غلط قسم کا انسان تھا۔ جو شخص ابہام کے بغیر اعلان کرتا ہے کہ کاروبار سلطنت کو چلانے کے سلسلے میں مذہب کو کیا سروکار اور محض مذہب کی وجہ سے نااہلوں کو ذمّہ وار عہدوں پر فائز کرنا مذمؤم ہے، اُسے متعصب اور تنگ نظر کہنا نہ صرف بہت بڑا ظلم بلکہ زیادتی ہے!

ایک اور امیر نے مرتے وقت عرض کیا کہ میرا مذہب وہی ہے جو آپ کا

ہے۔ اس پر اورنگ زیب مُسکرا دئے اور فرمایا...... بچوں کی بہبود کی وجہ سے ایسا کہنے پر مجبور ہو گئے ہو۔ پھر فرمایا۔ "مارا بہ مذہب کسے چہ کار؟ عیسیٰ بدینِ خود، موسیٰ بدینِ خود۔" ان اظہاروں کے بعد بدستور اورنگ زیب کی تنگ نظری کی رٹ لگانا بجائے خود تنگ نظری نہیں تو کیا ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہوسکتا ہے اورنگ زیب نے سیاسی مصلحت کی وجہ سے ایسا کیا ہو اور عملاً وہ تنگ نظری کا ہی قائل رہا ہو۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ ایسا نہیں۔ تاریخ میں کم و بیش سَوا سَو نام ایسے ہندو امیروں، راجاؤں اور ہزاری منصب داروں کے ہیں جو صاحبِ طبل و علم تھے اور کچھ فرمان ایسے بھی اصلی حالت میں موجود ہیں جہاں اورنگ زیب نے ہندوؤں کے عبادت خانوں کے لئے زمینیں اور جائدادیں وقف کی تھیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں یہ اندازہ کرنا مُشکل نہیں کہ اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی سوچی سمجھی سکیم انگریزوں نے کیوں بنائی تھی اور اس کو آلہ کار بنا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے دِلوں میں بغض و عداوت کا وہ بیج بویا جس نے انگریزوں کو ڈیڑھ سو سال تک حکمرانی کا موقعہ دیا۔ اور جب یہاں سے چلے گئے تو ملک کے دو حصے کر کے گئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جو نقصان انگریزوں نے کیا ہے اُس کی تلافی کے لئے گذشتہ بائیس برس میں کچھ نہ کیا گیا۔ لیکن اُمید ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جھوٹ اور بہتان بازی کی دُھند ہٹ جائے گی اور حقائق کا روشن چہرہ نموٗدار ہو گا!

اورنگ زیب ذاتی طور پر بڑا بہادر، راست باز، خُدا ترس، مُنصف

مزاج اور خطا پوش تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر کام میں بادشاہ کو یہ خیال رہتا تھا کہ کہیں وہ خُدا کے غضب کا شکار نہ ہونے پائے۔ اپنے اہل کاروں، امیروں اور وزیروں کو بار بار یاد دِلاتے رہے کہ وہ اللہ کی گرفت سے ڈرتے رہیں اور عوام کو تکالیف اور مصائب کا سامنا نہ کرنے دیں! اپنے مدار المہام کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

" آن فدوی (دستور معظم اسدخاں) بخان جہاں بہادُر بنویسد کہ سودا گران اسپان وغیرہ استغاثہ می نمایند۔ خبر صحیح است الظُلم ظلمات یوم القیمہ۔ چہ رو منظور نہ داشت؟ یاد موت کہ قریب تر اَز شہ رگ اوست چرا گذشت از سخط الٰہی وغضب پادشاہی بترسد و آنہار ارضا مند گُند۔"

(دستور معظم خان جہاں بہادر کو لکھے کہ گھوڑوں کے سوداگر اور دوسرے لوگ فریاد کر رہے ہیں۔ ظُلم کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وہ قیامت کے دِن اندھیرے کی صورت میں سامنے آئے گا۔ اس صورت حال کو خانِ جہاں نے کیوں پسند کیا؟ موت کو اُس نے کیسے بھُلا دیا جو اُس کی شہ رگ سے زیادہ نزدیک ہے۔ اُسے چاہیے کہ خُدا کے قہر اور بادشاہ کے غضب سے ڈرے اور ان فریادیوں کو خوش کرے) ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"...... ایں عاصی خواہد کہ مرتکب ہیچ گناہ معصیتے خاصتہً ظُلمے نہ شود۔ اماز انجا کہ ملک بے سیاست نمی ماند و ریاست بے سیاست راست نمی آید۔ بعضے جاہا احکام موافق آں وقت بغلبۂ نفس بے اختیار صادر می شود۔ الحمد للہ کہ نیّت خود بخیر

است شاید کہ نگیرد۔"

(یہ گناہ گار تو یہ چاہتا ہے کہ اس سے کوئی گناہ، نافرمانی اور خاص کر ظلم سرزد نہ ہو۔ لیکن چونکہ ملک سیاست کے بغیر پائدار نہیں اور حکومت سیاست کے بغیر سازگار نہیں۔ کبھی کبھی نفس کے غلبے میں آ کر کچھ ناگوار احکام بھی دینے پڑتے ہیں۔ مگر خُدا کا شکر ہے کہ اس میں نیت نیک ہوتی ہے۔ شاید اللہ تعالےٰ اپنی گرفت میں نہ لے لیں۔")

اورنگ زیب ایسے مردم شناس کو معلوم تھا کہ اُس کے جانشینوں کی ذہنی استعداد کتنی ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہ کاروبار سلطنت کو چلانے کے بالکل نااہل ہیں اور بار بار کہتا رہا کہ میرے بعد سب سے بڑا المیہ جو ہونے والا ہے، وہ یہ کہ خون خرابہ ہو گا۔ اور بندگان خُدا کا خُون ناحق ہو گا جو بہت بڑا ظُلم ہے۔ اپنے بیٹے کو لِکھتا ہے کہ فاضل خان علاء الملک نے میرا زایچہ بنایا تھا اور اُس کے مطابق تمام باتیں ٹھیک ہوتی رہیں۔ اس کے مطابق میرے بعد جو بادشاہ ہو گا اُس کے اوصاف یہ ہیں:

"بے خبرے، تنگ نفسے، معدوم الضررے کہ کلماتش ہمہ ناتمام و تدبیرش ہمہ خام باشد۔ برائے بعضے ایں قدر شاد ابے کہ قریب نہ غرق باشد و برائے برخے ایں ہمہ خشکی کہ بیم زوال باشد بعمل خواہد آورد۔"

(ایک بے خبر، تنگ نفس اور بے ضرر بادشاہ، جس کی ساری باتیں ادھوری اور ساری تدبیریں کچی ہوں گی، کچھ لوگوں پر اتنا فیاض کہ وہ بخشش کے

دریا میں ڈوب جائیں اور کچھ لوگوں کے لئے اتنا ممسک کہ وہ زوال سے دوچار ہو جائیں) اور پھر لکھتا ہے:

"ایں ہمہ صفاتِ حمیدہ وحالاتِ پسندیدہ درذاتِ شمادر یافت می شود۔ اگرچہ وزیرے لایق کہ درعمل ما پیش آمدہ است بہم رسانیدہ ایم، متعاقب خواہم فرستاد لیکن چہ فائدہ؟ کہ چہار رکنِ سلطنت یعنے اولاد اربعہ ہرگز بے چارہ رابحالِ خُودنخواہند گذاشت کہ کارے بکُند۔"

(یہ "اعلا" صِفات اور "پسندیدہ" خصائل آپ کی ذاتِ گرامی میں جمع ہیں۔ اگرچہ ہم نے اپنے تجربے سے ایک لایق وزیر کو پالیا ہے اور جلد ہی اُسے آپ کے پاس بھیج رہے ہیں۔ لیکن اس کا فایدہ کیا ہے؟ سلطنت کے چار ارکان یعنے چار بیٹے اُس غریب کو اپنے حال پر چھوڑ کر کوئی کام تھوڑے ہی کرنے دیں گے!")

ظُلم اور فساد اور خونریزی کو روکنے کے اسباب پر سیر حاصل بحثیں کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو ایک جگہ لکھتا ہے کہ "مجھے آج ہی نظر آ رہا ہے کہ میرے مرنے کے بعد کون سا ہنگامہ بپا ہونے والا ہے"۔ پھر دُعا کرتا ہے:

"ایزد مُقلب القلوب توفیق حفاظت خلق اللہ کہ ودایع بدایع خالق اند نصیب کُناد۔"

(دِلوں کو بُرے کاموں سے پھیرنے والا خُدائے بُزرگ تُم لوگوں کو خلق اللہ کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ عام لوگ تمہارے ہاتھوں میں اللہ کی

امانت ہے۔) کون ایسے بادشاہ کو ظالم، جابر اور تنگ نظر کہہ سکتا ہے؟

اِس موضوع پر اورنگ زیب کا یہ خط پیش کر کے اس کو ختم کر رہا ہوں۔ خط اپنے بیٹے کو لکھا ہے اور کہتا ہے:

"ایک روز میں میاں عبداللطیف قدس سرہ، الشریف کی خدمت بابرکت میں حاضر ہُوا۔ اثنائے گفتگو میں، میں نے کچھ گاؤں بطورِ جاگیر خانقاہ کے مصارف کیلئے پیش کئے۔" فرمایا:

شاہ مارا دہ دہد مِنّت نہد

رازقِ مارِزق بے مِنّت دِہد

(بادشاہ گاؤں عطا کرتا ہے تو احسان جتاتا ہے۔ میرا رازق رِزق بے مِنت عطا کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا، بالکل بجا ہے۔ لیکن اِن گاؤں کی پیش کش مِنت کے ارادے سے نہیں بلکہ اپنے صلاح و فلاح اور خیرِ دارین کے لئے کر رہا ہوں۔ فرمایا اگر یہ نیّت ہے تو محنت کش کِسانوں کو زمینوں کی پیداوار کا اکثر حصّہِ دے دیا جائے اور کچھ حصّہِ بطور مال گذاری وصول کر کے متوکل گوشہ نشینوں کے معاش کے لئے وقف کر دیا جائے۔ مظلوموں کی دادرسی کی جائے تاکہ کسی کا حق تلف نہ ہو۔ طاقت ور کمزوروں کے دباؤ میں نہ آئیں۔ صلاح و فلاح اور خیرِ دارین خود بخود حاصل ہوگا۔" فرمایئے ان باتوں سے کہیں بھی آپ کو تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی بُو آتی ہے؟

تصوّرِ آخرت ایک سچے مُسلمان کے عقیدے کی بنیاد ہے اور واقعہ یہ

ہے کہ اورنگ زیب تصورِ آخرت سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں رہا ہے۔

اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں کہ چمار کونڈہ سے قادر آباد تک کا راستہ پُر خطر ہو گیا ہے اور لٹیروں نے مسافروں کی زندگی حرام کر دی ہے۔ پھر کہتے ہیں:

"از احوالِ بد روزِ جزا چرا علم ندارید۔ فکرِ مآل فی الحال باید کرد۔ الدنیا مزرعۃ الاخرۃ۔ ظالمے از عالمے درحقِ خُود فاتحہ خیر خواست جواب یافت دربارہ ستم گاراں خبردار مظلوماں دُعائے خیر اثر ندارد۔"

(آپ روزِ جزأ کے حال بد سے کیوں بے خبر ہیں۔ انجام کی فکر تو آج ہی کرنی چاہیئے۔ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو یہاں بوؤ گے، وہاں کاٹو گے۔ ایک ظالم نے ایک عالم سے دُعائے خیر کی درخواست کی۔ عالم نے کہا۔ ظالموں کے حق میں کوئی دُعا قبول نہیں ہوتی۔ جب تک وہ مظلوموں کی فریاد رسی نہ کریں۔)

ایک اور خط بالکل اسی قسم کا ہے۔ مدار المہام کے نام لکھتے ہیں:

"بہ فرزند عزیز بہادُر مابنویسد کہ دُنیا رفت و آخرت آمدنی شُد چیزے کہ یادگار خواہد ماند بکار خواہد آمد و ہمراہ بغارِ گور خواہد رفت ہمیں امورِ خیر کہ باقیاتِ صالحات است، امروز خودرا از فردائے رفتگاں باید دانست و عاقل آنست کہ حالِ راکہ بین الماضی والا استقبال است غنیمت داند و امرِ خیردہ صلاح آنچہ تواند بعمل آرد، حال رارفتہ و آیندہ راشدہ پندارد۔"

(فرزند عزیز کو لکھتے ہیں کہ دُنیا جا رہی ہے اور آخرت کا سامنا ہونے والا ہے۔ جو چیز یادگار رہے گی، وہی کام آئے گی۔ نیکی اور مفادِ عامہ کے جتنے

باقی رہنے والے کام ہیں وہی قبر کی تاریکی میں ساتھ آئیں گے۔ تمہارا "آج" اوروں کا "آنیوالاکل" ہے۔ دانا وہ ہے جو حال کو جو ماضی اور مستقبل کے درمیان میں ہے، غنیمت سمجھے اور جتنے بھی نیکی کے کام ہیں، عمل میں لائے اور ایسا کرتے وقت زمانۂ حال کو ماضی اور مستقبل کو بھی ماضی ہی سمجھ لے(کیونکہ وقت پر کسی کا اختیار نہیں) تصوّرِ آخرت انسانی کردار کی دُرستی کے لئے ایک ہی تیر بہدف نسخہ ہے۔ یہ عقیدہ راسخ ہو جائے تو انسان اپنے ہر قول و فعل، ہر حرکت اور ہر حال میں محتاط رہتا ہے۔ اور استحضار موت کے ذریعہ ہر دَم کو آخری دَم اور ہر سانس کو آخری سمجھتے ہوئے اپنی اصلاح میں محو رہتا ہے۔ اورنگ زیب کے تمام خطوط، تمام فرامین اور خُود اس کے روزانہ لائحہ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونون چیزیں یعنی استحضارِ موت اور تصوّرِ آخرت اُس کی زندگی کے دو اہم عناصر رہے ہیں۔ قوّتِ عمل اور قوّتِ ارادی میں یہ شخص بے مثال ہے۔ 91 سال کی عمر میں اُس کی وفات ہوئی۔ اُس وقت تک برابر اُس کا پاؤں رکاب میں تھا۔ منشی محمدؒ کاظم بن محمدؒ امین نے اپنی کتاب "عالم گیر نامہ" میں لکھا ہے کہ یہ شخص عجیب و غریب تھا۔ تخت نشینی کے بعد کلام اللہ کو حفظ کیا۔ بادشاہ کے چہرے سے کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مسرؤر ہیں یا فکر مند، ہر حال میں چہرے پر ایک سی کیفیت رہتی تھی۔ ساری عمر اس کی زبان سے ایک دفعہ بھی کوئی ناز یبا لفظ نہیں نکلا۔ شراب، زِنا، لہو ولعب سے کوسوں دُور تھا۔ ہفتے میں دو راتیں شب بیدار رہتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود صرف زاہدِ خشک نہ تھا اپنے پوتے شہزادہ محمدؒ بیدار بخت کو ایک خط

لکھا۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ شہزادہ کی شادی ایک سیّد زادی سے ہوئی تھی۔ ایک دِن میاں بیوی میں کسی بات پر تُو تُو میں میں ہوئی اور شہزادے نے سیّدزادی سے کہا کہ ایک پاجی کی لڑکی کو شہزادوں کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے۔ واقعہ نویس نے یہ واقعہ بھی لِکھ بھیجا۔ اور اورنگ زیب نے یہ حسین و جمیل خط اپنے پوتے کو لِکھا:

صُبح دم مُرغِ چمن باگل نوخاستہ گفت
نازکم کُن کردریں باغ بسے چوں تو شگفت
گُل بخندید کہ ازراست نرنجم لیکن
ہیچ عاشق سُخن تلخ بہ معشوق نگفت

"بہ آن نورالابصار واضح باد کہ درایّامِ جوانی کہ بہ اصطلاح پواج مصاحبان شما جوانی دیوانی گویند مارا ہم دراں ایّام تعلق باشخصے کہ نہایت تجتر داشت بہم رسیدہ بود۔ تاحیات محبتِ اورا بانجام رسانیدیم۔ وگاہے آزردہ نکر دیم، دیگر آنکہ باسادات لفظ پاجی گفتن محض پاجی گری است۔ کسے اگر سیدرا پاجی بگوید البتہ پاجی نخواہد شُد۔ اگر از نوشتۂ محل دار و ناظر رضامندی آں سیدہ نہ شود بہ عتاب بلکہ بہ عذاب گرفتار خواہد شُد۔"

(چمن میں بُلبُل نے صبح کے وقت پھُول سے کہا۔ اتنا نہ اِترا۔ تُجھ ایسے ہزاروں پھُول اس باغ میں کھلتے آئے ہیں اور اب بھی ہیں۔ پھُول ہنس دیا اور کہا۔ بات تُو نے سچی کہی ہے اور سچی بات سے خفا نہیں ہونا چاہئیے۔ لیکن یہ بھی تو

ہے کہ کسی عاشق نے آج تک اپنے معشوق کے ساتھ تلخ کلامی نہیں کی ہے......

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے پاجی مصاحبوں کی اصطلاح میں جوانی دیوانی کا عالم ہم پر بھی تھا، اور اسی زمانے میں ہم بھی ایک محبوب پر فریفتہ تھے۔ جب وہ زندہ رہی، ہم نے اس کے ساتھ محبت کے روابط قائم رکھے اور کبھی اُس کا دِل نہ دُکھایا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص سید کے لئے پاجی کا استعمال کرتا ہے وہ خُود پاجی پنا دِکھاتا ہے۔ سیّد، سیّد ہی رہے گا، پاجی نہیں بنے گا۔ اگر محلدار اور ناظر ہمارے پاس یہ رپورٹ نہیں بھیجے گا کہ آپ نے اس سیّد زادی کا دِل خوش کیا ہے تو عتاب بلکہ عذاب میں گرفتار ہونے کا امکان ہے!"

سخت گیر، زبردست اور خشک اورنگ زیب کے پہلو میں بھی آخر دِل تھا۔ خُدائے جمیل کا سچا بندہ پرستارِ جمال نہ ہوگا تو اور کون ہوگا!

☆☆☆

حسن شاہ اور اُس کا زمانہ

مقالے کا عنوان ہے حسن شاہ اور اس کا زمانہ، اور مجھے زمانہ کے لفظ اس کے محدوٗد اور وسیع معنوں کے اُلٹ پھیر سے اُلجھن پیدا ہو رہی ہے۔ وسیع معنوں کا خیال کرتا ہوں، تو زمانے کو لامحدود پاتا ہوں اور اسے ماہ و سال اور روز و شب کی قیود سے بالا تر دیکھتا ہوں۔ زمانہ ایک ایسی کیفیت ہے، جو صاحبِ زمانہ یعنی خالقِ روز و شب کی طرح اولِ بلا ابتدا اور آخر بلا انتہا ہے۔ جس کا نہ کوئی ماضی ہے، نہ مستقبل، بلکہ اس کی ہر کیفیت ایک مستقل حال ہے۔ جو جاوداں، پیہم دواں اور ہردم جواں ہے، اس پر بڑھاپا نہیں آتا۔ یہ کبھی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ نہ کبھی سکون اور اطمینان سے پاؤں پسار کر نہیں بیٹھتا۔ ایک ایسی کیفیت کو ایک فانی انسان کے ساتھ منسوب کرتے وقت مجھے جھجک محسوس

ہوتی ہے۔ زمانہ خُدا ہے اور خُدا کسی ایک انسان کا نہیں ہو سکتا، مگر اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے مجھے زمانہ کے لامحدوُد اور وسیع تصور سے ہٹنا پڑے گا۔ اور اُسی کیفیت کو زمانہ کہنا پڑے گا، جو سلسلہ روز و شب کی مرہونِ مِنّت ہے۔ جو نقش گرِ حادثات ہے۔ جو اصلِ حیات و ممات ہے۔ جس سے تارحریرِ دورنگ بنتی ہے۔ جس سے خالق کائنات کی ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ کہیں مسیح کے روپ میں جلوہ گر ہو کر عفو و حلم کا مجسّمہ اختیار کر لیتی ہے، کہیں سپردگی اور بے خودی کا عالم بن کر ابراہیم کی طرح آگ میں کود پڑتی ہے۔ اور کہیں عربی لباس میں اپنا جمالِ جہاں آرا دکھاتی ہے اور ہر دیکھنے والے کی زبان سے بے اختیار نکل پڑتا ہے۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ زمانہ بے بہر بھی ہے اور ماں کی محبت بھری آغوش بھی، یہ زمانہ دموں کا الٹ پھیر ہے، جو کبھی بلندیوں میں بدلتا ہے اور کبھی بلندیوں کو قعرِ مذلّت میں گراتا ہے، یہ زمانہ کبھی گداؤں کو سرِراہ کلاہ جمشید پہناتا ہے، اور کبھی شہریاروں کو پابہ زنجیر کر کے اُن کی آنکھوں میں سلائی پھیر دیتا ہے۔ یہ زمانہ بڑا بے رحم، سفّاک اور ظالم ہے۔ شیر کی طرح بہاوُر، بھیڑئے کی طرح خونخوار اور لومڑی کی طرح مکّار ہے۔ یہ زمانہ بڑا متین، بڑا سنجیدہ اور پُرکار ہے۔ شیر کی بہادُری کے ساتھ ساتھ اس میں گائے کی سپردگی ہے، بھیڑئے کی خونخواری کے ساتھ ساتھ اس میں کتے کی وفاداری بھی ہے۔ اور لومڑی کی مکاری کے ساتھ ساتھ اس میں اونٹ کا استقلال

بھی ہے۔ اس میں پہاڑوں کا وقار بھی ہے، اور تنکوں کی سبکی بھی۔ اس میں انسان کی شرافت بھی ہے، اور درندوں کی خوں آشامی بھی، یہ زمانہ کبھی زید کو آسمان پر بٹھاتا ہے، اور وہ اپنے مقدر پر ناز کرتا ہے۔ مگر ذراسی دیر میں اُس پر یہ حقیقت بھی واشگاف ہو جاتی ہے، کہ وہ جس مقام کو آسمان سمجھتا تھا، وہ بکر کی زمین ہے، غرض میں آپ سے کیا کہوں یہ زمانہ کیا ہے، یہ مداری ہے، یہ شعبدہ باز ہے، جہاں گرد ہے، شیاد گیسو باف ہے۔ صحرانشین بدو ہے، اور محلوں میں رہنے والا شہنشاہ ہے، جو خود ایک حالت پر قانع نہیں رہتا۔ نہ وہ آدم کی اولاد کو ایک حالت پر قانع رہنے دیتا ہے۔ اُس کو بھی زمانے نے جدّت پسند اور تنوّع دوست بنا دیا ہے، جو خُود زمانے کی طرح شرر سے ستارہ، ستارہ سے سورج مانگتا ہے، جو اس کی انتہا ڈھونڈتا ہے، جس کی کہیں انتہا نہیں۔ اُس کی نِگاہ ناشکیب ہے، مگر اُس کا دل اُمید سے بھرپور ہے۔ اور یہی بوقلمونی اس کو خلافت اِلٰہی کی موزونی بخشتی ہے۔ یہی تغیّر ہے، جواللہ کی سپاٹ کاینات میں رنگ بھرتا ہے۔ اور اسی رنگ آمیزی سے یہ ویرانہ رہنے بسنے کے لائق ہوا ہے۔

میں اپنے موضوع سے بہت دور جا پڑا ہوں، مجھے آپ کو حسن شاہ اور اُس کے زمانے کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ مگر اس کا کیا کیجئے، کہ حسن شاہ کا زمانہ عام زمانوں کی خصوصیات سے خالی نہیں۔ آج کل کے لوگ اکثر کہتے ہیں، کہ ہمارے زمانے میں اتنے زبردست تغیّرات رونما ہوئے ہیں، جو ماضی میں صدیوں میں ہوا کرتے تھے، اور ہمیں برسوں کی راہ چند دنوں میں چلنا پڑی ہے،

مگر کونسا زمانہ تھا، جب انسان اسی حالت میں گرفتار نہ تھا۔ حسن شاہ کا زمانہ کوئی بہت پُرانا زمانہ نہ تھا۔ اس دنیا سے گئے ہوئے اُسے ابھی پون صدی بھی نہیں گذُری، وہ 1833ء میں پیدا ہوا اور 1898ء میں اپنے مولیٰ سے جاملا۔ شمسی حساب سے وہ 65برس جیا، اور قمری حساب سے 68سال۔ ستر بہتر سال کوئی بہت دُور کا زمانہ نہیں، اس کے باوجود جب ہم اُس زمانے کو دیکھتے ہیں، تو وہ بھی اپنے رنگ میں اتنا ہی پُر آشوب زمانہ نظر آتا ہے۔ جتنا آپ کو اور مجھے اپنا زمانہ خوفناک اور سفاک دکھائی دیتا ہے، حسن شاہ نے اپنی زندگی کے مختصر عرصے میں چار سلطنتیں دیکھیں۔ وہ انقلاب بھی دیکھا، جب ایک سلطنت کا چراغ گُل ہوا۔ اور دوسری شہنشاہی اُس جگہ آموجود ہوئی، اور اس دوسری شہنشاہی میں حسن شاہ کی عین حیات میں تین حکمران یکے بعد دیگرے اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔ میں نے آپ سے کہا، کہ حسن شاہ کی ولادت 1833ء میں ہوئی۔ اپنی طفولیت کے تیرہ سال اُس نے سکھوں کی حکومت میں گذارے۔ مغلوں، پٹھانوں اور سکھوں کے دور تسلط میں کشمیر پر اُن کا مقرر کیا ہوا گورنر حکومت کرتا تھا۔ یہ گورنر مطلق العنان حاکم ہوتا تھا۔ سیاہ وسفید کا مالک اور کسی جواب دہی سے بے نیاز، اسلئے عام لوگوں کے رنج وراحت کا انحصار اُس گورنر کے مزاج پر منحصر ہوتا تھا۔ اگر گورنر شقی القلب ظالم اور درندہ صفت ہوتا، تو عام لوگوں کی زندگی جہنم بن جاتی، اگر کبھی گورنر رحم دل، انصاف پسند اور اور انسان دوست ہوتا، تو لوگ آرام سے رہتے۔ مگر شر پسند عناصر سر اُبھارتے، اور گورنر کی شرافتِ ذاتی

کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر فِتنہ و فساد کا دروازہ کھول دیتے۔ حسن شاہ نے سکھوں کے عہد حکومت کے صرف تیرہ سال دیکھے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ تیرہ سال سخت قسم کے سیاسی خلفشار اور افراتفری کے تھے، مہاراجہ رنجیت سنگھ مر چکا تھا اور اُس کی جگہ اس کا نابالغ بچہ تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ اور ہوسِ اقتدار میں بدمست لوگ آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ کشمیر سکھ سلطنت کا ایک حصہ تھا، اس لئے اس کا متاثر ہونا، غیر قدرتی نہ تھا۔ اس آخری دور میں سکھوں کی طرف سے پہلے شیخ محی الدین گورنر تھے۔ جن کے متعلق حسن شاہ لکھتا ہے کہ ذاتی طور پر آدمی بڑا مُنصف مزاج، نیک دل اور رعایا پرور تھا۔ اس زمانے میں سرینگر میں کشمیر کے بہت بڑے ولی شیخ احمد تارہ بلی رحمتہ اللہ علیہ مرجع خلائق تھے۔ اور شیخ محی الدین کو بھی ان سے ارادت تھی۔ حضرت شیخ کے کہنے پر ہی شیخ محی الدین نے دربار لاہور سے کہہ سُن کر جامع مسجد واگذار کرا دی۔ جسے سکھوں نے کشمیر پر قبضہ جماتے ہی بند کر دیا تھا۔ اور شیخ موصوف کے کہنے پر ہی شیخ محی الدین نے مسکینوں، فقیروں اور سادات کو ایک لاکھ خروار شالی بطور جاگیر دلوا دی۔ شیخ محی الدین سے پہلے کشمیر کا گورنر مہاں سنگھ تھا۔ جو بہت سخت گیر تھا۔ اور اُس نے عوام کی ضروریات کو نظر انداز کر کے بہت سا غلّہ بچا کر رکھا تھا۔ شیخ محی الدین نے عوام کو قحط کی مصیبت سے نجات دلانے کے لئے یہ غلّہ دس آنہ فی خروار کے حساب سے بانٹ دیا۔ اس سے اناج کی قیمتیں بڑھ گئیں۔ اور نواحی علاقوں میں ایک روپیہ میں ڈیڑھ خروار شالی بکنے لگا۔ شیخ محی الدین پر عتاب نازل ہوا، کیونکہ اُس کی سرکردگی میں جو فوج

مظفر آباد کے راجاؤں کو زیر کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی تباہ ہوئی اور مہاراجہ شیر سنگھ نے شیخ محی الدین کو نہ صرف معزول کیا، بلکہ اُس سے چار لاکھ روپیہ بطور جرمانہ وصول کیا۔ شیخ محی الدین پر عتاب جاری ہی تھا، کہ شیر سنگھ قتل ہوا۔ اور اُس کے بھیجے ہوئے سرداروں نے مظفر آباد کے راجاؤں کے ساتھ صلح صفائی کی، اور واپس بھاگ گئے۔ شیخ محی الدین کے بعد کشمیر کی گورنری ہیرا سنگھ کو ملی۔ ہیرا سنگھ نے بے شمار حماقتیں کیں، اور پایان کار اپنی بے وقوفیوں کا شکار ہوا اور ہلاک ہو گیا۔ دربار لاہور آخری سانس لے رہا تھا، اور اقتدار کی رسہ کشی میں لوگوں کے سر اُڑ رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا، قاعدہ قانون اور ضابطہ نام کی تمام چیزیں رخصت ہو گئی تھیں، لاہور سے مہارانی ڈولتے سنگھاسن کو بچانے کیلئے کبھی ایک سردار کو کبھی دوسرے رئیس کو اپنا طرفدار بنانے کی کوشش کرتی۔ رشوتیں دی جاتیں، اور حکومت میں شرکت کا لالچ دیا جاتا۔ دونوں طرف سے یہ کاروبار جاری تھا، اور عوام چکی کے دو پاٹوں میں گھُن کی طرح پسے جاتے تھے۔ بالآخر سکھ سلطنت کا ستارہ غروب ہوا، اور مہاراجہ گُلاب سنگھ نے ڈوبتے سورج سے منہ موڑ کر چڑھتے سورج کی پوجا کی، اور انگریزوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے میں کامیاب ہوا اور کشمیر کو 75 لاکھ روپے میں خرید کر رسوائے زمانہ معاہدہ امرتسر کی داغ بیل ڈال دی۔ سکھوں کے عہد حکومت کے تیرہ سال حسن شاہ کی طفولیت کے تیرہ سال تھے۔ مگر حسن شاہ ظاہر ہے، کہ بے حد ہُشیار اور ذہین آدمی تھا۔ وہ اس سے متاثر ضرور ہوا۔ اور جب گلاب سنگھ نے کشمیر میں آ کر نظم و نسق سنبھالا،

اور کسی نہ کسی طرح ایک ضابطہ روبعمل لانے کی کوشش کی تو حسن شاہ کو سکھوں کے زمانے کی بدنظمی کے مقابلے میں یہ نظم وضبط تاریکی میں روشنی لگا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حسن شاہ نے مہاراجہ گلاب سنگھ کی بے جا تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اور اسی کے لفظوں میں مہاراجہ گلاب سنگھ عقل و تدبیر میں لاثانی، فہم و فراست میں بے نظیر۔ فریادیوں کا فریادرس، لٹیروں اور بدمعاشوں کا دشمن، رعایا پرور اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود حسن شاہ سچی بات کہہ جاتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے، کہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے بدنظمی اور بدانتظامی کا قلع قمع کیا، مگر وہ سخت قسم کا فرقہ پرست بھی تھا، اُس کے زمانے میں ہندوؤں کو اعلےٰ مناسب ملے اور مسلمان ذلیل و خوار ہوئے۔ اعلیٰ خاندان کے مسلمانوں کی جائدادیں ضبط کردیں، اہلِ حرفہ پر کمرتوڑ ٹیکس لگا کر اُن کو معاشی مصائب میں گرفتار کیا۔ کیونکہ ان کی اکثریت مسلمانوں کی تھی، لوگوں پر غربت، خانہ جنگی اور افلاس کی وجہ سے سکھوں کے زمانے سے جو رقمیں بقایا تھیں، وہ بڑی سختی سے وصول کی گئیں اور ہر مسلمان سے نکاح ٹیکس ایک روپے سے ڈھائی روپے کر دیا گیا۔

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا بے حد ضروری ہے، کہ کشمیر کے دستکار اور صنّاع بڈشاہ کے زمانے سے دنیا کے لوگوں سے خراج تحسین حاصل کرتے آئے تھے۔ ان دستکاریوں میں اعلی ترین درجہ کشمیر کی شالبافی کو تھا۔ جہاں بڈشاہ نے ان صنّاعوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے ان کو خاص وظیفے مقرر کئے تھے،

وہاں اُن کے جانشینوں نے ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اُن کے فن پارؤں کے قبول عام کو دیکھ کر فیصلہ کیا، کہ ان سے ٹیکس وصول کئے جائیں اور خزانے کی تجوریاں بھر دی جائیں، مختلف زمانوں میں یہ ٹیکس مختلف صورتیں اختیار کرتے رہے، اور شالبافوں کے لئے زندگی وبال بن گئی۔ کچھ زمانوں میں وہ اس سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انھوں نے اپنے انگوٹھے کٹوا دئے تاکہ وہ اس بلا سے نجات حاصل کرسکیں۔ حسن شاہ کے زمانے یعنی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد حکومت میں شالبافوں سے فرداً فرداً ٹیکس وصول کرنے کے بجائے اسے پنڈت راجہ در کو ٹھیکے پر دیا گیا۔ اس وقت تک حکومت کو اس مد میں سالانہ چار لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی تھیں۔ پنڈت راجہ در نے 12 لاکھ روپے خزانے میں بھر دیا۔ اور ٹیکس شالبافوں سے وصول کرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص سرکار کو چار لاکھ کے بجائے بارہ لاکھ روپے دیدے وہ اِن سے کتنا وصول کرے گا، اور اس وصولی میں اُن پر کونسی قیامت ٹوٹتی ہوگی۔ یہ محصول کارخانہ داروں سے نہیں بلکہ براہ راست شالبافوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اور ہر شالباف ایک کارخانہ دار سے منسلک رہتا تھا۔ اور اُسے اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ ایک کارخانہ دار کو چھوڑ کر دوسرے کارخانہ دار کے پاس جائے۔ نتیجہ یہ تھا کہ کارخانہ دار شالبافوں سے مہینے میں سو روپے کا کام لیتا تھا، مگر اُسے سات آٹھ روپے سے زیادہ نہ ملتا تھا، اس میں پنڈت راجہ کاک در کے اہلِ کار تین چار روپے وصول کرتے اور ہر فن کار فالتو وقت میں بھیک مانگ کر پیٹ پالتا۔

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اُس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دو شالہ

اس ظلم و جبر نے اس صنعت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ صنّاعوں اور فن کاروں کی تباہی کے علاوہ کشمیر کی اکثریت کسانوں کی تھی۔ ان کے متعلق حسن شاہ لکھتا ہے، کہ بطور مالیہ سرکار ان سے جو روپیہ وصول ہوتا تھا، اُس کی عام قیمت سوا روپے کے برابر تھی، مگر کسانوں کو ایک روپیہ مجراے دیا جاتا تھا۔ اس طرح اُسے چار روپے کے بجائے پانچ روپیہ دینا پڑتا تھا۔ سرکاری کام کسانوں سے جبراً اور بلا معاوضہ کرایا جاتا تھا۔ اور اوسطاً ایک کسان پر سرکاری عملے کے سات آدمی مسلط تھے۔ جن کے خوف، ڈر اور ہراس سے اُن کی زندگی عذاب بن گئی تھی۔ ایک سرکاری اہلکار گاؤں کی ساری بستی کو ہانکے لے جاتا تھا۔ اور وہ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بول سکتے۔ عوام کی دل دوز حالت کا علم انگریزوں کو بھی ہوا، اور انھوں نے لوگوں کی اصلی حالت کو معلوم کرنے کے لئے اپنے ایک اعلےٰ افسر کو کشمیر بھیج دیا۔ سرینگر میں مائسیمہ کے پاس ایک وسیع میدان تھا۔ وہاں لوگ جمع کر دئے گئے اور انگریز افسر نے اُن سے پوچھا، کہ انھیں انتظامیہ کے خلاف کوئی شکایت تو نہیں۔ مہاراجہ اس صورت حال سے پریشان ہوا تھا۔ مگر پنڈت راجہ کاک در نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ اُس نے لوگوں کو قبل از وقت خبردار کیا تھا، کہ اگر کسی شخص نے کوئی ناگوار بات کہی، تو اُس کو کولھو میں پلوا دیا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ لوگوں نے یک زبان ہو کر مہاراجہ اور

اُس کی حکومت کو بے حد قابلِ اطمینان بتا دیا۔ انگریز افسر دل برداشتہ ہو کر واپس گیا۔ لوگوں کے مظالم روز بر وز بڑھتے گئے۔ نت نئے ٹیکسوں نے اُن کی کمر توڑ دی، اور جینا محال ہو گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے شیر گڈھی میں گدادھر کا مندر تعمیر کیا۔ اور اس کے لئے کسانوں سے فی خر وار ایک پاؤ شالی سالہا سال تک وصول کیا گیا۔ اور مندر کی تعمیر پر لاگت کا انتظام اسی طرح ہوا۔ سرکاری اہلِ کار ہر نئے ٹیکس کے ساتھ اپنی رشوت ستانی کا ایک اور دروازہ کھول دیتے اور دو دو ہاتھوں سے غریب عوام کو لوٹتے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے استور اور دراس کی خود مختار حکومتوں کو تسخیر کرنے کے لئے لشکر کشی کی، اور اس سلسلے میں باربرداری اور رسد کے انتظامات لوگوں سے مُفت کرائے گئے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ خود سوپور میں بیٹھا اور لوگوں کو اپنے گھروں سے نکلوا کر ہزاروں کی تعداد میں پکڑوا لیا اور بیگار پر بھیج دیا۔ ان لوگوں کے پاس نہ پہننے کو کپڑے تھے، نہ کھانے کو اناج۔ نتیجہ یہ ہوا، کہ ہزاروں مظلوم منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی منزل آخرت کو روانہ ہوئے۔ حسن شاہ نے ان مظالم کی داستان بڑے دلدوز پیرائے میں بیان کی ہے۔ استور کے بعد گلگت نیپال اور یاسین کی تسخیر کے معرکے ہوئے اور کشمیر کے بے زبان عوام کی جان پر بھی بن آئی۔ اور بیگار میں پکڑے ہوئے لاکھوں انسان لقمہ اجل ہو گئے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی، کہ کسانوں سے ان کی پیداوار کا سولھواں حصہ ہر سال حکومت کو اسلئے دینا پڑتا تھا کہ اس سے خاندانِ شاہی کے لباس کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ یہ خوفناک اور شرمناک ٹیکس کچھ عرصے

کے بعد معاف کر دیا گیا۔

حسن شاہ کے زمانے میں اور ڈوگرہ سلطنت کے اوائل میں کشمیر کے عوام کو جن تباہیوں سے دوچار ہونا تھا، ان میں سب سے زیادہ خوفناک یہ تھیں (۱) بیگار (۲) قحط (۳) سیلاب اور وبا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کا محل بھی ایک دفعہ جل کر خاکستر ہو گیا، اور اس کی تعمیر نو کا معاملہ بھی عوام کے لئے بلائے ناگہانی بن گیا۔ اس کے ساتھ مہاراجہ کا پرائیوٹ آفس بھی جل گیا اور اس میں جو روپیہ تھا، وہ سرکاری اہلکاروں نے نکال کر خُرد بُرد کر لیا اور اس کو آگ کے نقصان میں کھپا دیا۔ جسے کشمیر کے عوام نے پورا کیا۔ عوام کی مایوسی اور بدحالی کا ذکر کرنے کے باوجود حسن شاہ نے مہاراجہ گلاب سنگھ کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ اور لکھا ہے، کہ مہاراجہ تقریباً گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد مرا۔ بڑا خوش قسمت، جفاکش، مدّبر، مستقل مزاج مگر سخت لالچی تھا۔ اس کی شجاعت اور بہادری کے قصے عوام میں مشہور تھے، اُس نے بے شمار دولت جمع کی تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مہاراجہ رنبیر سنگھ تخت نشین ہوا۔ حسن شاہ رنبیر سنگھ کی تعریف میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے مقابلے میں زیادہ رطب اللسان ہے۔ رنبیر سنگھ نے کشمیر کی حکومت کے لئے گورنر مُقرر کیا اور اس کا سب سے پہلا گورنر دیوان کرپارام تھا، جس کے متعلق حسن شاہ کہتا ہے کہ وہ نہایت نیک سیرت اور عالی ہمت آدمی تھا۔ رنبیر سنگھ نے سب سے پہلے کشمیر کا انتظامی ڈھانچہ بنا لیا۔ ضلع اور تحصیلیں بنائیں۔ ہر ضلع میں ایک وزیر اور ہر تحصیل میں تحصیلدار مقرر ہوا۔ عدالتیں قائم کی گئیں، اور قابل

لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ فوج کی باقاعدہ تنظیم بھی اسی مہاراجہ کے عہد میں ہوئی۔ دیہات اور قصبوں میں مکتب اور پاٹھشالائیں کھولی گئیں۔ آمد و رفت کے ذرایع کو بہتر بنانے کے لئے سڑکوں کی تعمیر کا کام اِسی مہاراجہ کے عہد میں شروع ہوا۔ سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے صحت افزا مقامات پر رہائشی مکانات تعمیر کرنے کا کام بھی اسی مہاراجہ کے زمانے میں کیا گیا۔ دیوان کرپارام کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے کشمیر کی گورنری کے منصب پر وزیر پنوں کو مقرر کیا۔ اور یہ تقرّر مہاراجہ رنبیر سنگھ کا سیاہ ترین کارنامہ ہے، یہ غلطی ایک نہیں دو دفعہ کی گئی، اور وزیر پنوں قہرِ اِلٰہی بن کر کشمیر کے لوگوں پر سالہا سال تک مسلط رہا۔ پہلی دفعہ تو خیر اس کے جوہر زیادہ نہ کھُل سکے، مگر جب اُسے گورنری کے عہدے سے ہٹا کر دیوان کرپارام کو دوبارہ گورنر بنا دیا گیا، تو اُس نے دیوان کرپارام کے مصائب میں اضافہ کرنے کی نیت سے تمام سرکاری گوداموں میں موجود غلّہ دریا بُرد کرا لیا۔ جب دیوان کرپارام نے چارج سنبھالا، تو سرکاری گوداموں میں ایک دانہ بھی نہ تھا۔ اندازہ کیا گیا ہے، کہ وزیر پنوں نے کم و بیش ایک لاکھ خروار غلّہ ضایع کرا دیا۔ مگر دیوان کرپارام نے حُسنِ تدّبر سے کام لیا اور بیرونِ کشمیر سے اناج منگوا کر شہر میں نفر شماری کرائی۔ اور باقاعدہ ہفتہ واری راشن کا انتظام کر دیا۔ جن لوگوں کو درآمد شُدہ اناج خریدنے کی استطاعت نہ تھی، انھیں مُفت راشن دیا گیا۔ اِسی گورنر نے کشمیر میں پانچ وزارتیں قائم کیں۔ وزارتِ شہرِ خاص، وزارتِ شوپیان، وزارتِ اننت ناگ، وزارتِ کامراج اور وزارتِ پہاڑ۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، کہ پنڈت راجہ کاک در کی مہربانی سے کشمیر کے شالباف دوزخ کی سی زندگی بسر کر رہے تھے، چنانچہ رنبیر سنگھ کے بعد اور دیوان کرپارام کی نظامت کے زمانے میں یہ مظلوم اور مفلوک الحال شالباف منظّم ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور دیوان کرپارام سے انصاف کے طالب ہوئے۔ راجہ کاک در نے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ اور دیوان کرپارام کو یقین دلایا، کہ یہ لوگ مُفسد اور بلوائی ہیں اور اُسے بھی قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر دیوان نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے ان پر ڈنڈے برسائے اور اندھا دھُند گرفتاریاں کرنے لگے۔ یہ مظلوم لوگ جان بچانے کے لئے بھاگے، سپاہیوں نے ان کا پیچھا کیا، اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد پُل حاجی راتھر پر سے دریا میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ حسن شاہ نے بھی ان مظلوم شالبافوں، کو بلوائی، مفسدہ پرداز اور شریر جماعت کے خطابات سے نوازا ہے۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ اِس حادثے کے صرف دو ماہ بعد راجہ درلقمۂ اجل ہوا۔ رنبیر سنگھ کے عہد میں بھی گلگت کی مہم سر کرنے کے سلسلے میں ہزاروں کسانوں کو بیگار میں پکڑا گیا، اور ہزاروں جانیں ضایع ہو گیں۔ دیوان کرپارام کے بعد دیوان ٹھاکورداس مختصر سے عرصے کے لئے کشمیر کا گورنر ہوا۔ اس کے متعلق حسن شاہ کہتا ہے کہ بڑا نکما اور رشوت خور تھا۔ سرکاری ٹیکس کے علاوہ وہ کسانوں اور کارداروں سے اپنا ذاتی ٹیکس بھی وصول کرتا تھا، اس کو برطرف کر دیا گیا، اور دوسری مرتبہ وزیر پنوں قہر الٰہی بن کر کشمیر پر نازل ہوا۔

اس شخص کے کارنامے دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے، کہ کیا انسان اتنا ظالم و سفاک بھی ہو سکتا ہے، حسن شاہ کہتا ہے، کہ وہ عوام کا فی سبیل اللہ دُشمن تھا۔ اور شرفا اور اعلیٰ خاندانوں کا سخت دشمن تھا۔ وزیر پنوں کے عہد نظامت کا اہم ترین واقعہ شیعہ سُنی فساد ہے۔ جس میں ہزاروں جانیں ضایع ہوگئیں۔ اور شہر کا اکثر حصہ جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ باہمی فساد سے جو نقصان ہوا، اُس پر مستزاد وزیر پنوں کا ظلم اور فوجیوں کی درازدستی تھی۔ اس واقعہ نے کشمیر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور اس کی چول چول ہلا کر رکھ دی۔ وزیر پنوں نے سُنی شرفاء کو خاص طور پر مصائب کا نشانہ بنا دیا۔ اور انھیں معاشی طور پر بالکل بے کار کر کے رکھ دیا۔ کشمیر کے عوام کا پیمانہ صبر لبریز ہوا۔ اور ایک دفعہ جب مہاراجہ رنبیر سنگھ اچھابل میں مقیم تھے، تو عوام کا ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہوا، اور وزیر پنوں اور اُس کے ظالم اہلکاروں کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ مہاراجہ نے حکم دیا، کہ ان مظلوموں کو اجازت ہے کہ وہ چک داروں اور اہلکاروں کو نظر انداز کر کے براہ راست اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ اس سے عوام کے حوصلے بلند ہوئے اور آناً فاناً ہوا بدل گئی۔ اور کسانوں نے تمام اہلکاروں اور چک داروں کو نرغے میں لے لیا، اور ان سے غبن کی ہوئی رقمیں فوراً وصول کیں۔ ان میں سے بہت سے اہلکار اور چک دار گرفتار کرا لئے گئے۔ وزیر پنوں کو یہ صورت حال سخت ناگوار گذری، کیونکہ وہ خود ایک خبیث روح کا مالک تھا اور یہ سارے رشوت خور اہلکار اور چک دار اُس کے بھائی بند اور ایجنٹ تھے۔ وہ غضبناک ہوا۔ اس نے اپنی طرف سے مہاراجہ کو ہموار

کر لیا، اور تمام ان لوگوں کو گرفتارِ بلا کرا دیا، جنھوں نے اچھا بل میں مہاراجہ کے سامنے فریاد کی تھی۔ پنوں نے ایسے قوانین وضع کر دیئے جن سے کسانوں کی ساری پیداوار بحقِ سرکار ضبط ہو جاتی تھی اور اُن پر خیانت کا الزام لگا کر گھر گھر تلاشیاں لی جاتی تھیں۔ اور اس صورت حال نے رشوت ستانی کا دروازہ کھول دیا۔ اور عوام کے تاخت وتاراج کی سبیل نکل آئی۔ قہرِ الٰہی کی ایک اور صورت یہ ہوئی، کہ ستمبر کے مہینے میں برفباری ہوئی اور فصلیں تباہ ہوئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہولناک قحط پڑا، جس میں کشمیر کے لوگ مکھیوں کی طرح مر گئے۔ بہت سے لوگ کشمیر چھوڑ کر جان بچانے کے لئے بھاگنا چاہتے تھے۔ مگر وزیر پنوں نے اُن پر روک لگا دی۔ اور اس طرح فاقہ کش مجبوروں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کیا۔ کہتے ہیں، کہ اُس کی اذّیت پسند طبیعت لوگوں کو اس طرح مرتے دیکھ کر ایک لذّت سی محسوس کرتی تھی۔ اس کی تاریخ وفات کسی ستم ظریف نے "ظالمِ اظلم" کے الفاظ سے نکال دی ہے اور اس میں وہ ساری تلخی نہاں و آشکار ہے۔ جو کشمیر کے عوام کو اس ظالم کے متعلق تھی۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اس آدمی کے بھیس میں حیوان نے ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے وہ نت نئے مظالم ایجاد کئے تھے۔ جن کے تصور سے ہی آدمی کا احساس لرز اُٹھتا ہے۔ حسن شاہ نے ان کی تفصیل لکھی ہے۔ معلوم نہیں مہاراجہ رنبیر سنگھ کو وزیر پنوں کے ان اعمال کا علم بھی تھا یا نہیں۔ اگر تھا اور وہ ان سے چشم پوشی کرتا تھا۔ تو اس کی معدلت گستری محل نظر ہے۔ جس کی تعریف حسن شاہ نے کی ہے۔ اگر ان تمام باتوں سے بے خبر

تھا، تو اُس کی وہ دور اندیشی اور ہشیاری بھی مشکوک ہے، جس کے متعلق حسن شاہ بہت کچھ لکھتا ہے۔ وزیر پنوں کو مہاراجہ نے نہیں بلکہ انگریزوں نے اپنے عہدے سے معزول کر دیا۔ وہ سات سال تک بلائے بے درماں بن کر کشمیر پر مسلط رہا، مگر کشمیریوں کی سخت جانی دیکھئے، کہ پنوں کے مظالم کے باوجود پنوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا کہ بارہمولہ سے رام بن تک کھنڈرات میں تبدیل کر کے کشمیر سے چلا جاؤں گا۔ پنوں کے بعد دیوان انت رام کشمیر کا گورنر ہوا۔ اگر چہ وہ ذاتی طور پر بڑا کریم النفس اور شریف آدمی تھا، اور اُس نے پنوں کے لگائے ہوئے زخموں پر پھاہا لگانے کی کوشش کی، مگر زخم اتنے گہرے تھے کہ دیر تک مندمل نہ ہو سکے۔ اُس نے بہت اونچی قیمت پر باہر سے غلّہ منگوا کر لوگوں میں مفت تقسیم کیا اور اس طرح حکومت کے خزانے کو تیس لاکھ روپے کا خسارہ ہوا۔ مگر کشمیر کی قحط زدہ قوم کی گرسنگی اور پنوں کے بداعمال عُمّال کی جڑیں اتنی مضبوط تھیں، کہ بگڑا ہوا آوا بڑی دیر تک نہ سنبھل سکا۔ حسن شاہ نے دیوان انت رام کو ایک خط میں لکھا ہے:

"احوال ملک نوعے کہ بود بدستور، بعضے رعایا آباد بعضے مغرور، خیانت کُنند گاں معرور، مالگزاراں مقہور۔ بدنامے منتظماں مشہور۔ در آبادی آیندہ و در بعض جا ہا گبان قصُور، در بے باقئے مالیات فتور، بندہ در توضیح و تشریح آں معذور۔"

ان چند الفاظ میں حسن شاہ نے دفتر کے دفتر بیان کر دیے ہیں۔ اور سارے کشمیر کی حالتِ ذار کا نقشہ کھینچا ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ میں نے حسن شاہ کے زمانے کے سیاسی حالات پر

زیادہ تفصیل لکھی ہے اور مجھے مختصر سا تذکرہ اُس دور کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بھی کرنا چاہئے۔

مغلوں کے زمانے سے کشمیر میں فارسی زبان سرکاری اور دفتری زبان تھی، اور جو شخص بھی امور مملکت میں حصہ لینا چاہتا تھا، اُس کے لئے فارسی میں مناسب دسترس حاصل کرنا ضروری تھا۔ فارسی جب کلام الملوک ہو گئی، تو باقی زبانوں خاص کر کشمیری زبان کو کون پوچھتا، وہ کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہوئی، ناقدری کی شکار ہوئی۔ سرکاری سرپرستی سے محرُوم ہو کر صرف عوام کے رحم و کرم کی محتاج ہو گئی۔ مگر عوام نے اسے نظر انداز نہیں کیا، اور وہ خاموشی کے ساتھ اس کی تزئین و آرائش میں مصروف رہے۔ حسن شاہ کے زمانے میں جو حسن شاہ کے علاوہ دو قابلِ قدر ہستیاں موجود تھیں۔ جنھوں نے کشمیری زبان کو اعلیٰ ترین مُقام بخشا۔ جن کے انمول موتیوں سے کشمیری زبان کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اور جنھیں کشمیری زبان اور ادب رہتی دنیا تک یاد کرتے رہیں گے۔ یہ دو محسن مقبول شاہ کرالہ واری اور عبدالاحد نادم تھے۔ مقبول شاہ کی مشہور رومانوی مثنوی گُلریز دُنیا کے کسی بھی ادب عالیہ سے ٹکر لے سکتی ہے۔ اُس کا گریست نامہ، اور پیر نامہ واقعہ نگاری، طنز اور انداز گفتار کا اعلی ترین نمونہ ہے اور کشمیر کا شاذ ہی کوئی ہو گا جو

ا

مقبول شاہ کی گُلریز سُن کر مست نہ ہوتا ہو، گریست نامہ اور پیر نامہ میں اگرچہ انداز ذم کا ہے۔ مگر اس میں سے مدح کا پہلو نکلتا ہے۔ اور کشمیری کسان جن

اخلاقی پستیوں میں گرفتار تھا۔ وہ براہِ راست اُن مظالم کا نتیجہ تھیں، جو اُن پر سالہا سال سے ہوتے آتے تھے۔ اِن مظالم نے کشمیریوں کو بزدل، جاہل، جھوٹا اور دغاباز بنا دیا تھا۔ وہ جہد للحیات میں مبتلا تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح آفات سماوی و ارضی کا مقابلہ کر کے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ پیہم غلامی نے ان اخلاقی پستیوں کو اس کی عادت ثانیہ بنا دیا تھا۔ گریست نامہ میں مقبول شاہ نے اُن کی تفصیل لکھی ہے۔ تجزیہ نہیں کیا ہے، تجزیہ ہمارا کام ہے اور ہم جانتے ہیں، کہ ان اخلاقی پستیوں کے اسباب کیا تھے۔

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس ساری قوم کا ضمیر بدل گیا تھا۔ اور ہر ناخوب خوب بن گئی تھی، ہر بُری عادت مرغوب تھی۔ اور ہر ناپسندیدہ شے محبوب، پیرنامہ میں خود ساختہ پیروں اور ملاؤں کے مکر وفریب کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ ان پیروں اور ملاؤں کا جنھیں سند ارشاد وراثت میں ملتی ہے۔ جن کے گھر بجلی کے چراغوں سے روشن ہیں۔ اور جن کے مریدوں کی کالی اور بے نور جھونپڑیوں کو مٹی کا چراغ بھی میسر نہیں۔ دوسرے بزرگ جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں، پیر عبدالاحد ناداِم ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں ایک اور صرف ایک میدان کے لئے وقف کر دیں اور وہ میدان ہے، نعت رسولؐ مقبول کا، اور واقعہ یہ ہے، کہ اس میدان میں اس صاحب درد و گداز نے وہ سدا بہار پھول کھلائے ہیں، جن کی مہک سے ناسوت سے

جبروت تک معطر ہے۔ اور جن کے سرحدی نغموں سے اللہ کے فرشتے بھی جھوم اُٹھتے ہیں۔ پیر عبدالاحد نادم حسن شاہ کے بھانجے بھی تھے۔ حسن شاہ کا انتقال 1316ء ہجری میں ہوا اور پیر عبدالاحد نادم 1327ء میں اپنے حقیقی مالک سے جا ملے۔ میں نے سُنا ہے، کہ نادم کم و بیش ستر برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ گویا حسن شاہ کی وفات کے وقت اُن کی عمر بھی پچاس اور ساٹھ کے درمیان ہو گی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کتنا فیض پالیا ہو گا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ حسن شاہ خود کشمیری زبان کے شاعر تھے، اور اعجاز غریبہ اُن کی ایک مستقل تصنیف ہے۔ مگر فن کے اعتبار سے اُن میں اور نادم میں کوئی مناسبت نہیں۔ نادم نے اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر رکھ دئے ہیں اس کا سبب دراصل یہ ہے کہ انھوں نے صرف ایک خاص صنف کو اپنایا۔ اور اس میں اُن کے دل کی واردات آ گئی۔ صنف کے علاوہ ہیبت بھی ایک ہی ہے، اور اس کو انھوں نے کہیں نہیں بدلا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں، کہ کشمیری زبان کس مپرسی کے عالم میں تھی، مگر یہ اس کی داخلی قوت ہے۔ جس نے اس کو اس برے حال میں بھی مرنے نہ دیا اور اس نے اپنے ایسے ایسے فداکاروں کو جنم دیا، جن کے افکار عالیہ دُنیا کی بہترین اور ترقی یافتہ ترین زبانوں کے شاہکاروں کے دوش بدوش کھڑے رہ سکتے ہیں۔

حسن شاہ کے زمانے میں قطب وقت جناب شیخ احمد تارہ بلی کی چھاپ تصوف کے ہر مکتبہ خیال پر تھی۔ اس خاندان کے ساتھ حسن شاہ کے خاندان کا بعد میں تعلق بھی ہوا۔ اور ان کے چھوٹے بھائی محمد شاہ کی ایک بیٹی حضرت احمد شاہ

تارہ بلی کے پڑپوتے کے ساتھ بیاہی گئی تھیں۔ دیہات میں حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کے ارادت مند زیادہ اورقصبات میں حضرت قادریہ کا غلبہ تھا۔ جو آج تک جاری ہے۔

اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر عرض کروں کہ زمانہ سیماب کی طرح بے قرار ہے، اور ہر لحظہ اس کی نئی شان اور نئی آن بان ہے۔ یہ کسی مقام پر نہیں ٹھہرتا۔ لوگ کسی کی تعریف تحمیق کرتے ہیں، تو کہتے ہیں، وہ بڑا زمانہ ساز ہے۔ زمانہ ساز کوئی نہیں ہوتا، اسلئے کہ زمانہ خود خالق ہے۔ اس کی تخلیق کون کر سکتا ہے، البتہ گردش روز و شب جسے ہم غلطی سے زمانہ کہتے آئے ہیں۔ اپنے پیچھے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ ان ہی میں راضی ہوتے ہیں، کچھ مُبہم، کچھ مستقل اور کچھ عارضی۔ خوش قسمت ہیں وہ جو اپنے پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جائیں، کہ آنے والے انسان ان سے نشانِ راہ پائیں۔ بدقسمت ہیں وہ جو روز و شب کی طرح آئیں اور گُمنامی کے غاروں میں جاپڑیں۔ ہم زمانے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، البتہ وہ ہمیں بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔ زمانہ لافانی ہے، اور اس کو سمجھنے والا بھی لافانی ہو جاتا ہے، اس کے لئے فکر نہیں نظر کی ضرورت ہے، اور نظر بھی کیسی؟

بڑی تیز جولاں بڑی زوٗ درس
ازل سے ابد تک دم یک نفس

☆☆☆

کشمیری شاعری

(حبہ خاتون سے وہاب پرے تک)

کشمیری شاعری کا سرسری جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حبہ خاتون سے پہلے لل دید اور شیخ نورالدین کے علاوہ اور کوئی نام قابلِ ذکر نہیں۔ یہ دونوں بزرگ ایک ہی مکتبہ خیال کے علمبردار تھے۔ اِن کے کلام میں سوز وگداز، بے ثباتی دنیا، خلوص عشق کی نایابی کا ماتم خاص موضوع ہیں۔حبہ خاتون پہلی شاعرہ ہے جس نے شاعری کو جذبات انسانی کے نکھار کے لئے استعمال کیا۔ اس کا زمانہ یوسف شاہ چک کا زمانہ تھا۔ اِسی زمانے میں مغلوں نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر دیا۔ اس کا لازمی اثر جو کشمیر کے عوام پر ہوا ہوگا وہ تو ظاہر ہی ہے۔ لیکن حبہ خاتون پر اس کا اثر زیادہ قوی تھا۔ اِس لئے کہ یوسف شاہ قید ہو کر کہیں اور گیا، حبہ خاتون جو بعض روایات کے مطابق اِس کی خاص ملکہ تھی۔ کشمیر میں ہی

رہی، اسے ہجر و فراق کی دشوار گھڑیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی روح چھِن گئی اور اِس کے دِل پر زبردست چوٹ لگی، وہ شاعر تو تھی ہی اور موسیقار بھی، یہ حادثہ اُس کے لئے تازیانے کا باعث ہوا، اور اُس کا کلام وارداتِ قلبی کا ایک انمول خزانہ ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے حبہ خاتون جدید شاعری کی معمارِ اوّل ہے۔ اِس نے لل دید اور شیخ نورالدین کے قائم کردہ معیار کو چھوڑ کر براہِ راست ایک ایسی راہ اختیار کی جس پر دنیا کا کم و بیش ہر انسان چلتا ہے۔ لل دید اور شیخ نورالدین کے کلام کا حلقہ اثر محدود تھا۔ یہ کلام اُن لوگوں کے لئے تھا جو اِس جہانِ گذران کی بے ثباتی سے واقف ہیں۔ اور اسے ہمیشہ رہنے والا گھر نہیں خیال کرتے، اِس لئے لل دید اور شیخ نورالدین کے کلام کا بازار محدود تھا۔ حبہ خاتون نے ہجر و وصال، غم والم، عشق و محبت اور جذبات و کیفیات کے گیت گائے، یہ متاع ہر آدمی کی ہے۔ اور اِسی لئے میں نے ابھی کہا ہے کہ حبہ خاتون جدید کشمیری شاعری کی معمارِ اوّل ہے۔

حبہ خاتون کے بعد جو شاعر آئے وہ اِسی کی تقلید کرتے رہے۔ البتہ اِس میں چند مستثنیات بھی ہیں۔ مثلاً خواجہ حبیب اللہ نوشہری، صاحب کول، مرزا اکمل الدین اکمل، روپ بھوانی وغیرہ جو بدستور لل دید اور شیخ نورالدین کی متابعت کرتے رہے۔ حبہ خاتون کی وفات غالباً 1606ء میں ہوئی ہے۔ 1740ء تک اِس کا اثر اگرچہ ظاہری طور پر نمایاں نہ ہوسکا، مگر وہ غیر محسوس طور پر شاعروں کے خیالات کو متاثر کرتی رہی، اِس کے بعد جو شاعرہ حبہ خاتون کے طرزِ فکر سے متاثر

نظر آتی ہے وہ ارنہ مال ہے۔ جس نے برابر اسی انداز میں عشق و محبت کے دلفریب گیت گائے ہیں۔ جو حبہ خاتون کی طرزِ خاص تھی۔ بعض حلقوں میں ارنہ مال اور حبہ خاتون کے کلام خلطِ مبحث پیدا ہو گیا ہے۔ کچھ گیت حبہ خاتون کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، حالاں کہ وہ ارنہ مال کے لکھے ہوئے ہیں اور اسی طرح ارنہ مال کے کلام کے کچھ حصے لوگ حبہ خاتون کی روشِ فکر کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک کشمیری شاعری کا کم و بیش یہی حال رہا۔ میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں، کہ اس دور میں صرف اتنے ہی شاعر ہوں گے جن کا کلام ہم تک پہنچا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ اور بھی شاعر ہوں گے۔ مگر چوں کہ ان کا کلام محفوظ نہ رہ سکا، اِس لئے وہ گمنامی کی موت مر گئے۔ جو شاعر محو ہونے سے بچ گئے، وہ یا حبہ خاتون کے مکتبہ خیال کے خوشہ چیں ہیں، یا لل دید اور شیخ نورالدین کی جلائی ہوئی شمع سے اپنی شمعیں روشن کرتے نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی نے کشمیری شاعری کا دامن مالا مال کر دیا اور جب ہم اِس صدی کے عظیم اور بلند فکر شاعروں کی قطار کو دیکھتے ہیں تو حیرانی ہو جاتی ہے کیونکہ ناسازگار ماحول کے باوجود ان کا اُبھر آنا کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں سوچھ کرالؔ اور مومنؔ صاحب ایسے بزرگ پائے جاتے ہیں۔ جن کے کلام میں تصوف کی چاشنی کے بغیر اور کچھ نہیں البتہ اِس صدی کا پہلا اور بڑا شاعر جس نے حبہ خاتون کے چلائے ہوئے مشن کو نقطۂ عروج پر پہنچایا۔ محمود گامیؔ ہے۔ محمود گامیؔ کی وفات غالباً 1855ء میں ہوئی ہے اس نے

ایک طرف سے لل دید اور شیخ نورالدین کی تقلید کا حق ادا کر دیا ہے۔ دوسری طرف سے اِس نے عشق و محبت اور ہجر و وصال کے گیتوں کا لافانی مجموعہ چھوڑ دیا ہے۔ کشمیری عورتوں کا مشہور ناچ "روہ" جس میں وہ گیت بھی گاتی ہیں، سب سے پہلے محمود گامؔی نے لکھا۔ اِس زمانے میں کشمیر فارسی ادب و انشا کا گہوارہ بھی بن چکا تھا، اس لئے محمود گامی نے فارسی کے خیالات کو کشمیری میں منتقل کر کے ایک نئی راہ کھول دی اور فارسی شاعری کی ہی ہیئت کشمیری زبان میں چالو کر دی۔ اور اس زبان کو سب سے پہلے دو مشہور اصناف سخن، غزل اور مثنوی کا سرمایہ عطا ہوا۔ محمود گامؔی کا ہم عصر ولی اللہ متو بھی ہے، جس نے مثنوی میں کشمیر کا مشہور لوک قصہ "ہیمہ مال ناگرِ آئے" تصنیف کیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فارسی ادب سے روشناس ہونے کے بعد کشمیری میں شاعروں نے اگر قصّے کہانیاں نظم بھی کر دیں تو وہ دیگر زبانوں سے مستعار لیں، مثلاً "یوسف زلیخا"، "محمود نامہ" وغیرہ۔ یہ شرف صرف ولی اللہ متو کو حاصل ہے کہ اُس نے کشمیر کی ایک لوک کہانی کو مثنوی کا جامہ پہنایا اور واقعہ یہ ہے کہ شاعری میں اِس آدمی نے شعر و سخن کے ساتھ انصاف کیا ہے، گلستان اور بوستان کی تعلیم انیسویں صدی میں ہر پڑھے لکھے کے لئے ایک لازمی جزو تعلیم تھا، ان دو کتابوں سے اِس دور کے شعراء نمایاں طور پر متاثر ہوئے ہیں شیخ سعدی ایک جگہ عورت کے متعلق فرماتے ہیں:

زنِ بد در سرائے مرد نکو ہم دریں عالم است دوزخ او

یا

تہی پائے رفتن بہ از کفش تنگ بلائے سفر بہ زدر خانہ جنگ

ولی اللہ متو نے غالباً شیخ سعدی سے ہی متاثر ہو کر لکھا ہے:

اکیس آشینو چھ آساں پیالہ بردار بیس پیادہ اناں بردار بردار

اسی زمانے کا ایک اور بلند فکر شاعر عبدالاحد ناظم ہے، جو بیجبہاڑہ کے رہنے والے تھے، اور جن کی وفات غالباً 1865ء میں ہوئی ہے۔ غزل، نعت، مثنوی اور "روہ" کے علاوہ اِس گراں قدر شاعر کی کچھ ہزلیات بھی ہیں، مگر افسوس کہ وہ کہیں محفوظ نہیں ،بعض دوستوں تک زبانی سلسلوں سے آئے ہیں۔ آنے والے چند برس میں وہ لوگ بھی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ جن کا حافظہ اِن انمول موتیوں کا خزانہ ہے اور اِس طرح سے وہ گراں مایہ متاع ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جائے گی۔ ناظم کو ہزل کہنے کی اولیت حاصل ہے، اور لطف یہ ہے کہ ان کا ہزل ایسا نہیں کہ اس کو بیان نہ کیا جا سکے۔ مہدیؔ اور حکیم حبیب اللہ نے بھی ہزلیات کہی ہیں، مگر ان میں سے اکثر حصہ ایسا ہے کہ اسے شائد کبھی قلم بند نہیں کیا جا سکے گا۔

محمود گامیؔ اور ولی اللہ کے بعد رسول میر کا نام آتا ہے۔ یہ عظیم شاعرِ شباب، شاعر جذبات ترجمان واردات، رازدان محاکات وہ پہلا شاعر ہے، جس نے کشمیری زبان میں جذباتی شاعری کو وہ شکل دی، جو اب تک نہ صرف قائم ہے، بلکہ اس کے بعد جو بھی شاعر آئے، انھوں نے کوشش یہی کی کہ وہ رسول میر کے مقلد اور متبع کہلائیں، مگر رسول میرؔ کا اپنا مقام ہے۔ کوئی دوسرا اِس مقام پر

شائد نہیں پہونچ سکے گا۔ رسول میرؔ نے غزل کو غزل بنا دیا، غزل کو غزل کی زبان عطا کی، کشمیری غزل کو وہ رتبہ عطا کیا، کہ وہ فارسی اور اُردو غزل کا مُنہ چڑانے لگی، نئی تشبیہیں، نئے استعارے، نئے انداز اور نئی راہیں دریافت کیں، عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال پہلے یہ شاعر اتنی بلندیوں پر کیسے پہنچا اور کیسے کہہ سکا:

فولاد ژاپُن پیؤم مشکل جانئے جدائی

رسول میرؔ کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی ادب کے منتہی تھے۔ اِسی کا اثر جابجا ان کے کلام میں موجود ہے، بعض مقامات پر تو مصرعوں کے مصرعے فارسی کے ہی نکل آئے ہیں اور یہ مصرعے بھی اتنے لطیف کہ خود فارسی شاعر اس پر رشک کرے، مثلاً:

طفل، شکم راغمت گہوارہ جنباں اے صنم!

کون سا فارسی کا شاعر اِس پر رشک نہیں کرے گا۔

اِسی زمانے میں کشمیری شاعری میں نعت گوئی کی بنیاد پڑی۔ نعت کی ابتدا اگرچہ محمود گامیؔ نے کی تھی مگر وہ نہایت ابتدائی کوشش تھی۔ رسول میرؔ کے ہم عصروں میں نعت گوئی کو جو فروغ میر ثناء اللہ کریریؔ نے عطا کیا۔ وہ آنے والے شاعروں کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوا۔ میر ثناء اللہ کریریؔ سید محمد مراد بخاری کی اولاد میں سے تھے، خودلا ولد رہے۔ اندازہ ہے کہ 1875ء میں ان کی وفات ہوئی، اِن کے کلام میں نعت اور منقبت کے سِوا اور کچھ نہیں۔ ایک دِل فریب

نعت کے دو تین بند آپ بھی سُن لیجئے۔ اِس سے اِس بندۂ خدا اور عاشقِ رسولؐ کے دِل کی کیفیت کا اندازہ کرنے میں مدد ملے گی۔ اور یہ طے کرنا بھی آسان ہو گا کہ نعت کو جِسے بعد میں عبدالاحد نادؔم بانڈی پوری نے آسمان پر پہونچا دیا، دراصل وہ پودا تھا جس کی آبیاری سب سے پہلے میر شاء اللہ کریرؔی نے کی، وہ بند یہ ہیں:

تھٲرِ پھیرِ زردی بَرِ گیہِ پوش   ہرٕ دِنےٚ واوَن نیوٗنَم ہوش
بُلبُلن ژلنُک کوٚر سنبھال   رحمتکہٕ نبیوو چھُ میٖون حال
کرِ کیٛاہ بَرِ پیٚٹھِ بیلہِ دِن ناد   گرِ تژ او اَسہِ ہاو گوڑِ جاداد
بنہِ کیٛاہ چھٔنہِ بیٚلہِ مُژ تہٕ بیٚیہِ مال   رحمتکہٕ نبیوو چھُ میٖون حال
ڈر چھُم ؤتھِ بیٹھِ آنَن ماتنگ   پٔنی شُر بأژ لاگنم جنگ
دپنَم پیٚژ کیٛاہ لَجی تُلہِ تال   رحمتکہٕ نبیوو چھُ میٖون حال

☆

نعت ایک مستقل صنفِ سخن ہے اور جس طرح عربی فارسی اور اردو میں شاعروں نے سرور کائناتؐ کی مدح و توصیف میں معانی کے دریا بہائے ہیں۔ اِسی طرح کشمیری میں بھی ان کی کمی نہیں۔ اولیّت کا سہرا میر شاء اللہ کریرؔی کے سر ہے۔

انیسویں صدی میں جس طرح محمود گامؔی اور رسول میرؔ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے ذہنِ رسا اور معنی یاب طبیعت سے شاعری کو نئے تقاضوں سے آگاہ کیا۔ اسی طرح ایک اور بزرگ بھی اِسی زمانے کی پیداوار ہیں، جو سچ مچ

ترقی یافتہ شاعری کے بابا آدم ہیں اور یہ بزرگوار مقبول شاہ کرالہ واری ہیں۔ اُن کی تین لافانی تصانیف گلریز، گریست نامہ اور پیرنامہ ہیں۔

کشمیر کا کون سا گھر ہو گا جو مقبول شاہ کو نہیں جانتا، کشمیر کا کون سا شخص ہو گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بوڑھا ہو یا جوان، پارسا ہو یا رند، فاسق ہو یا متّقی جو گُلریز سے نا آشنا ہے۔ کس کے کان اِس دلفریب لے سے کھڑے نہیں ہوتے، جو گُلریز کی خاص لے ہے۔ قید خانے کی چاردیواری میں اگر ایک قاتل محبوس ہے اور اس کے کان میں گلریز کی لے آتی ہے تو موت اِس پر آسان ہو جاتی ہے۔ ایک عابد مرتاض ماسوے اللہ اگر فکر آخرت میں محومراقبہ ہے، اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں، جب وہ دور سے ایک گڈریئے کی آواز میں مقبول شاہ کا یہ لافانی نغمہ سنتا ہے:

خدایا عشقہٕ رُستوٗے کانٛہہ مہٕ آسِنٛز کرُن عشقٕن گدائی شاہ مہٕ آسِنٛز
مہتو واوو ژٕ کیٛاہ زانکھ میٛہ کیٛاہ گوَ گمٕژ چھِم وأٔلنٛجہٕ دم گیرٕنئے سرو
خدا غم کاسِنے تھٔونِے پھلہٕ وُن سُہ چھُکھ ئلراونِے یَس چھُکھ للہٕ وان

☆

"گُلریز" ایک کہانی ہے۔ ایک مکمل کہانی، جو دور حاضرہ کے تنقیدی معیاروں پر پوری اترتی ہے۔ جس کا ایک دلفریب آغاز ہے، جس میں بے شُمار اتار چڑھاؤ ہیں اور جس کا ایک حسین انجام ہے، اِس کہانی کا ہیرو عجب ملک ہے اور ہیروئن نوش لب، کردار نگاری، محاکات، سیرت نگاری اور واقعہ نویسی میں جو

کمالِ فن مقبول شاہ کو حاصل ہے، اِس پر دوسری زبانوں کے مایہ ناز شاعروں کو رشک آ سکتا ہے۔ اس کے اکثر اشعار پہلی مرتبہ سننے کے بعد ہی دل میں بس جاتے ہیں۔ گُلریز یوں تو ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک سدا بہار چمن ہے لیکن ہجر و فراق کے جذبات کو جس فن کاری اور چابک دستی سے مقبول شاہ نے نبھایا ہے اِس کی نظیر ملنا محال ہے اور اسی طرح تصویر کشی میں اس کے ذہن کا موقلم اِس تیزی سے چلتا ہے کہ انسان کی نظر اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ مقام خاص طور پر ملاحظہ فرمایئے۔ واقعہ یہ ہے کہ نوش لب اور عجب ملک بعد خرابی بسیار ملے، رات کو ایک باغ میں آرام فرمایا۔ باغ کی کیفیت ملاحظ ہو:

بہارُک اِبتدا اردی بہشت اوس — سؤنچِت مست باغ زَن باغ بہشت اوس
لگان آسہِ پوشہِ ڈالین واوِ گرایہِ — ہُراں اُس عُطر باغس جایہِ جایہِ
گلِ واوِنے پیٹھ بُلبُل مست — زِپبورک ہتھ ورق زَن آس دُردست
گُلبن پیٹھ ڈیٹھشِتھے گلہائے انار — ژلاں بُلبُل گُلبن ما اوس تھاوان نار
چمن تہِ ڈؤری بُری بُری اُس پوشو — سگوءمتی چینکو نافر فرووشو
اُچھ پوشن لچھن ہئز آسنہ گزئد — کچھ کنہِ نسترن اَندر شکر قنْد

☆

رات کو عجب ملک اور نوش لب اسی باغ میں رہے، نوش لب کی ماں وہاں بیٹی کی تلاش میں آئی، وہاں اسے ایک اجنبی کے ساتھ محوِ استراحت دیکھا تو اِس پر آسمان ٹوٹ پڑا، ایک اور لڑکی نازمست وہاں تھی جو عجب ملک کی منہ بولی بہن تھی۔

نازمست نوش لب کی ماں کی پروردہ تھی، وہ قدرتی طور پر اس سے خفا ہوئی، اس کا اظہار بھی ذرا ملاحظہ فرمایئے:

دپن با نازمست اَزغایت قہر — چھُ پُزی پاَٹھی یَن لین میانِہن اَتھن زہر
بدی، زانِہہ مہٕ کَر تِہٕ ثاَبتھ — بُدی کڈٕتھم ژٕ دِیُت تھم رُت عطا مانتھ
خطا کینٛہہ چھے نہٕ راہ سُہ دِی میٚہ پانس — مہٕ پانے پژان مُوم زعفرانس

☆

قصہ کوتاہ نوش لب کی ماں نے حکم دیا کہ عجب ملک کو ترکستان کے صحراؤں میں پھینک دیا جائے، نوش لب کو چپکے سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لٹا دیا جائے، حکم کی تعمیل ہوئی، دوسرے دِن نوش لب جاگی تو اِس کی حالت غیر تھی، اب اس کی خود کلامی ملاحظہ ہو:

وَنان اُسس بخود باچشم پُر آب — سو راتچ مجلسا آسہِ ہے خواب
کُسو سوزے کُسو باوی یہِ تقریر — پکیم کُس توت سِوائے بادِش بگیر
ہتو ما صبحکے خوش بویہِ داو ہ — نتونس گلعذارس میانہِ گراوہ
زگر دِراہ ژٕ سوامن دنزہ ارل — پِس انگہ نڑ نڑ گرچھنس برس تل
ادب رچھی تھو صدا کرزیَس بحلقہ — مدا آہستہ دنزلس مدر حلقہ
نِنہدر پاوِتھ ژلُن، ژورے روا چھا — تھٔوَن پتھ داغ مستورے روا چھا
ژٕ رہِتھ کُمہ شپتھ دِیتَنم تھٕرئے — لد یتھ تاسس پیم طوس اتھرے
یئٔبر زَل بوبنبورِ نہِ مایہِ وَجتھس — پھرٔ کہِ دنہِ ژرٔ گر کہ دنہ کرایہ تجتھس

پونارس ہجرکس مَنز چھس حطب زَن   وٗنس دود ون کرم تم سربسرزن
دوپہرن شام کوٗرنَم خام کارے   دُرس گوم فوطہ رووم طوطہ ہارے
ملالہ گوئیَ کمیک مکہ پڑِھ مہٖ روٹھک   کمس طالع درس اقبالؔ بیوٹھکھ

اِن اشعار کا مفہوم کسی دوسری زبان میں ادا نہیں ہوسکتا، ایک بات اور بھی خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔ زبان دیکھئے ہجر و فراق کی رو داد ایک خاتون کی زبانی ہے۔ اور زبان بھی وہی خواتین کی ہے، الفاظ کے انتخاب میں جس احتیاط سے کام لیا گیا ہے، وہ کمال فن کی دلیل ہے۔ ان اشعار میں الفاظ کی بندش اور چستی نے وہ موسیقیت پیدا کر دی ہے کہ زاہد خشک بھی تر دامنی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مقبول شاہ کا ایک اور کارنامہ ان کا " گریست نامہ " ہے۔ یہ جاگیر دارانہ سماج میں کسان کی محرومی اور مسلسل غلامی کے سبب اِس کی مسخ سیرت کی داستان ہے۔ اگر چہ اس میں کسان سے ہمدردی کا پہلو کم ملتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کسان کی سیرت نگاری کا حق ادا کیا گیا ہے کہ غلامی اور مجبوری انسان کو تمام اخلاق فاضلہ سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ خودغرض، مکار، فریبی، جھوٹا اور خوشامدی بنتا ہے۔ انیسویں صدی کا وسط جاگیر دارانہ استحصال کے عروج کا زمانہ تھا اور کشمیر کا کسان ان تمام اوصاف سے یکسر عاری ہو چکا تھا۔ مقبول شاہ نے نہایت خلوص اور دیانت داری سے اس وقت کے ساکن کی سیرت کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے اِس وقت کی سماجی اور مجلسی اور سیاسی زندگی کی مکمل تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ مقبول شاہ اِس لحاظ سے ہمارے فن کے امام

ہیں کہ اِس نے صرف عشق و حسن اور ہجر و وصال کی شاعری پر بس نہ کیا " گریست نامہ " مجبور طبقے کی داستان ہے "پیرنامہ" استحصالی عناصر کا خاکہ ہے۔ اس میں مقبول شاہ نے لگی لپٹی کے بغیر پیروں پر سخت تنقید کی ہے۔ پیرانِ کرام اور شیوخ عظام نے عوام کے تزکیہ نفس کا عظیم کام کیا تھا۔ مگر ان کے جانشینوں نے اس کو دکانداری کا جامہ پہنایا، خود نیکی سے دور ہوتے گئے اور اپنے مریدوں کو دور تر لیتے گئے۔ کارن یہ کہ ان میں جوہر ذاتی نہیں، صلاحیت نہیں، اہلیت نہیں، یہ پیر اس لئے ہیں کہ پیروں کی اولاد ہیں۔

میراث میں آتی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہی بات آج سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے مقبول شاہ نے کہی، اِس نے اِن خود ساختہ پیروں کو دیکھا، خود پیرزادہ تھا، اِس کا جی جل گیا اور وہ پُکار اُٹھا۔

اڈیی الحمدہ پڑی پڑی چھکھ گوھان ژیر
چھِ نیران فنگرِ گنڈی گنڈی اُسی بنے پیر

مقبول شاہ نے پیروں کی دو قسمیں بتا دی ہیں، ایک تو وہ جو جبہ و عمامہ والے پیر ہیں جو رئیسوں کی طرح رہتے اور امیروں کی طرح جیتے ہیں/جن کے ساتھ خدمت گار، جلودار، صوفی، مرید اور نہ معلوم کون کون سے لوگ ہوتے ہیں، جن کا کیمپ بادشاہوں کی طرح ہوتا ہے، جو عیش و عشرت کی المناک زندگی میں بے حِس پڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے وہ جو خرقہ پوش ہیں جو نہاتے نہیں، جو اپنے

آپ کو پارسا ظاہر کرتے ہیں مگر پارسا پیرہنی کے باوجود فسق و فجور اور استحصال کے رکن رکین ہیں، پیرنامہ کو پڑھیے، آج بھی آپ کو اِس میں لذّت ملے گی، اور پڑھتے پڑھتے بہت سی صورتیں آنکھوں کے سامنے آئیں گی، ادبِ عالیہ کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ ہر زمانے کا ترجمان ہوتا ہے۔

غزل بھی مقبول شاہ نے لکھی، مگر وہ رسول میرؔ اور محمود گامیؔ کے مرتبے کو نہ پاسکا۔ رسول میرؔ کی غزل غزل ہے۔ وہاں پہنچنا ہر ایک کا کام نہیں۔

عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

فارسی والوں نے کہا ہے:

در شعر سہ تن پیمبر انند ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری وسعدی

کشمیری زبان میں بھی انیسویں صدی کے اوائل میں تین عمائد ہیں، جنھوں نے کشمیری شاعری کو مہذب زبانوں کی صف میں کھڑا کیا ہے، اور وہ ہیں محمود گامیؔ، رسول میرؔ اور مقبول شاہؔ۔

مقبول شاہ سے براہِ راست متاثر ہونے والوں میں وہاب پرے ہے، یہ شخص انیسویں صدی کے نصف آخر کا شاعر ہے۔ اِس نے اپنی زندگی میں بہت سے سیاسی انقلاب دیکھے، نشیب و فراز سے دو چار ہوا، اور اس کی ساری زندگی ایک شدید کش مکش میں گذری۔ وہابؔ پرے کا رُتبہ اصل میں ایک مترجم کا ہے۔ اِس نے فردوسی کے "شاہنامے" حمید اللہ کے "اکبر نامے" اور "سلطانی" کا

ترجمہ کیا اور سب سے پہلے ترجمے کی داغ بیل اِسی نے ڈالی، اپنے زمانے کے خلاف شہر آشوب کی شکل میں اپنے دور کے تمام رسوم و رواج، عقائد و ضوابط، سیاسی افراتفری، مجلسی اور معاشرتی برہمی کا ہُو بہو نقشہ کھینچا، میرا خیال ہے وہاب پرے نے یہ سب کچھ مقبول شاہ سے متاثر ہو کر کہا ہے۔ عوامی معاشرت کی ایک جھلک وہاب پرے کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

پاژھِ رۆستوٗی اوس ہر کانٔسہ مُنل آسان پھرن
اوس کوٗشر پوٗژھ بعضے افسرن بختاورن
اکھ زٕ زَن ید آسہِ ہن گامس اَندر دستار والی
مُنلوٗی اوسُکھ پھرن تے منلوٗی بیٚیہِ جامہِ ناٗلی
اُس منجی ٹوٗپۍ آسان کیٛاہ عجائب فتیلہِ دار
چھِٹ کرٕ نس اوسنہِ کینٛہہ تَت زَمانس اعتبار
اوس چھِٹ ہا کپُر ذافر بازر زیادہ تر
گرٕ ینہِ نیٚ اُس گذر اناہ کران اصلی ہُنر
توٗشہِ کوٗرے اوس قرِمیزی کساباہ بیٚیہِ کُے
کاسبَن نِش اوس آسان تولہِ کینٛز اوس ہرہ کُے
گرٕیس بابہِ اُس قرمیزی رنگہِ آسان ہنگہ توٗجۍ
سیر وزنہِ پانٛژھ گز میٛنتھ برابر پاو کھجّی
نیٚ شراب وچائے و قہوہ چرس بھنگہِ چُرٹھ ناس

نِے ڈبل ژۆٹ زانہٕ ہَن نِے کیک نِے بسکوٗٹ اُسی
نِے گلوٗبندو نہِ پتلون و نہَ کوٹ و بوٗٹ اُسی
تتھ زمانَس اوس خالص نوٗن درمصرف بکار
کأنسہِ تژکھ کأنسہِ ژِ تژکھ تِے کأنسہِ باہ تژکھ کأنسہِ کھارٕ
گامہٕ والس اُس کأشر ناس بیٚیہٕ کینٛہہ نوٗن تیل
زیادہ کم صابن، تماکوٗ، زرد چوب و زنجبیل
تتھ زمانَس منٛز مروٗج اوس نہَ کینٛہہ تہٕ روٗپھ تہ سُون
آٹھ دٕہ روپیہ زنانَن اوس زیور ہیرِ بون
آسہِ لاگان کأژاہ بنکرے بیٚیہٕ سرتل زیادہ تر
سون راہ اکھ ٹینک اوس، سرتلِے ہُند کأر گر
تتھ زمانَس منٛز مسلمان کرِہے ہدا پنہٕ ودل
سأرِی ہے دوہَس پرٛیشان اوس آسان گوبرہ مول
قسطِ قسطِ اوس ہوران ظألمن کشیرٕ چیہ دیار
اوس درشان مقرر ہر أکِس تفصیل وار
تمہٕ وٕنکی ظلم کأیتاہ آنہِ بُو اَندر شُمار
لوٗٹہٕ حأکم اُس، کیُتھ کیاہ اوس مُلکس گٹہٕ کار

وہاب پرےؔ نے مجلسی اور اقتصادی زندگی کی یہ تصویر کشی 1854ء سے 1887ء تک کے کشمیر کی ہے، خود اِس کی وفات 1911ء میں ہوئی، شاعری کے فن

کے اعتبار سے وہاب پرے کا کلام اگرچہ نقائص سے پاک نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ اس خامی کے باوجود اِس نے کشمیری ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ترجموں کے ذریعہ سے اس نے کشمیری زبان کا دامن وسیع تر کر دیا اور اپنے وقت کے حالات لکھ کر آنے والی نسلوں کے لئے ایک دلفریب سرمایہ چھوڑ گیا۔ وہاب پرے نے غزل بھی لکھی کیوں کہ وہ اس میدان سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ غزل وہاب پرے کا میدان نہیں۔ وہ واقعہ نویس ہے اور واقعہ نویسی کرتے وقت اِس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ واقعہ کو تفصیل سے بیان کرے اور جزئیات بھی تذکرے میں آجائیں۔

وہاب پرے کے زمانے کا ایک اور شاعر بھی ہے جس کے تذکرے کے بغیر یہ مقالہ نامکمل رہے گا۔ اس کا نام نامی مولوی صدیق اللہ حاجنی ہے۔ اِس نے بھی بعض ترجمے کئے ہیں اور اس کا کلام بحیثیت مجموعی دینی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، وہ عام شاعری کی طرف راغب نہ تھا، بلکہ وہاب پرے پر ایک چوٹ بھی فرما گئے ہیں۔

چھاپہِ مدہم تہٕ سام شہہ نامہٕ یِی گوھس خوش تہٕ اَنہِ درخامہٕ
شعرس اندر اُئن حٔدیث و قرآن سہٕل کأماہ چھنہ چھُ بار گراں

فنی اعتبار سے مولوی صدیق اللہ کا کلام اغلاط اور زحافات سے پاک ہے۔ اور وہاب پرے کے مقابلے میں یقیناً زیادہ بلند ہے۔

☆☆☆

خواجہ غُلام السیدین

بات 1938ء کی ہے، میں محکمہ تعلیم میں ایک ادنےٰ مُدرس تھا۔ اچانک سارے محکمے میں ایک ہل چل سی ہوئی، اور ہر شخص نئے ڈائریکٹر ایجوکیشن کا ذکر کرنے لگا۔ معلوُم ہوا کہ یہ صاحب بہت نو عمر ہیں۔ بڑے قابل ہیں، اور اُستادوں کے سود و بہبود کی طرف اُن کا خاص دھیان ہے، کہ اُس وقت چھوٹے چھوٹے سکولوں کے استادؤں کو کوئی خاص مرتبہ حاصِل نہ تھا۔ اور وہ خُود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے تھے۔ تحصیل کا چپراسی بھی اپنے آپ کو پرائمری سکول کے اُستاد سے برتر سمجھتا تھا۔ اور سماج میں بھی کچھ اِسی قسم کا تصور رائج تھا۔ اِن استادوں کے ساتھ ان کے افسر بڑی بدتمیزی سے پیش آتے تھے اور یہ بچارے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ نئے ڈائریکٹر ایجوکیشن کا نام خواجہ غُلام

السیدین تھا۔ اور یہ بات محکمے میں آگ کی طرح پھیلی، کہ وہ اُستادوں کے ساتھ بہت ہی عزّت و احترام سے پیش آتے ہیں اور کسی اُستاد سے اُس وقت تک بات کرنے پر تیار نہیں ہوتے، جب تک وہ ان کے ساتھ کُرسی پر نہ بیٹھ جائے۔ یہ بات اُس زمانے میں عجیب سی تھی۔ ناقابلِ باور بھی اور ناقابلِ فہم بھی، مگر بات سچی تھی۔ انہی دنوں ایک واقعہ ہوا۔ سرینگر سے پانچ چھ میل دُور حیدر پورہ ایک گاؤں ہے، وہاں پرائمری سکول تھا۔ اور اس میں ایک اُستاد علی پیر تھے۔ علی پیراب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ اور آج کل حج بیت اللہ کی غرض سے حجاز گئے ہوئے ہیں۔ یہ صاحب روز حید پورہ سے سرینگر آتے، اور دوسرے دن صبح پھر اپنی ڈیوٹی پر جاتے۔ ایک دن وہ سکول پہنچے، تو وہاں انھوں نے قاضی محمد اسحاق انسپکٹر آف سکولز کو موجود پایا۔ قاضی صاحب انہی دِنوں انسپکٹر ہوئے تھے۔ ورنہ وہ ساری عمر کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ فارسی خُوب جانتے تھے۔ سخت شراب پیتے تھے، اور اپنی فارسی دانی کا زعم بھی اچھا خاصا تھا۔ علی پیر نے جب انسپکٹر آف سکولز کو اپنے مدرسے میں موجود پایا، تو ظاہر ہے کہ ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ انسپکٹر صاحب نے اُن سے دیر سے آنے کا سبب پوچھا، پیر صاحب بولے کہ ابھی دس نج رہے ہیں۔ انسپکٹر صاحب کے غصے کا پارہ چڑھا، گفتگو سکول سے باہر سڑک پر ہو رہی تھی۔ سڑک کے آس پاس دھان کے کھیت تھے۔ انسپکٹر صاحب نے پیر صاحب کو مُکا مارا اور دھان کے کھیت میں گر گئے۔ اُن کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہوئے، اور وہ اسی ہیت کذائی میں سرینگر آئے اور

تازہ وارد ڈائریکٹر ایجوکیشن کے دفتر میں اُن سے مِلے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ سیّدین صاحب بہت شرمندہ ہوئے، انھوں نے پیر صاحب سے معذرت کی اور چند دنوں کے اندر اندر قاضی محمد اسحٰق صاحب کا تبادلہ ہوا۔ دفتری نظام میں اُس زمانے میں یہ بات عام تھی، کہ افسرانِ بالا جب استاد کو خط لکھتے، تو شروع اس طرح ہوتا۔ "تمہارے نام قلمی ہے کہ......"

اس قسم کے کچھ مراسلے سیّدین صاحب کی نوٹس میں آئے اور اُنھیں فوراً بند کر دیا گیا، اور افسران کو بتا دیا گیا، کہ اگر کوئی افسر اُستاد کو، "تُم" کہہ کر خطاب کرے، تو اس کے خلاف سخت کاروائی کی جائے گی۔ اِن باتوں سے اُستادوں کو اپنا مقام نظر آنے لگا۔ اور وہ ذہنی طور پر انسانوں کی سی زندگی گذارنے لگے۔ میری پہلی مُلاقات سیّدین صاحب سے ایکس چینج روڈ پر اُن کی قیام گاہ پر ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب ہم ابھی خوف و دہشت کی فضا میں تھے۔ اور جب مجھ سے اصرار کیا گیا، کہ میں کُرسی پر بیٹھ جاؤں، تو ایک نا معلوم خوف، حیرت و استعجاب کے ملے جلے جذبات نے مجھ پر قابو پا لیا۔ اور میں سیّدین صاحب کو اپنا مافی الضمیر نہ بتا سکا۔ دوسال کے بعد میرا تبادلہ بانڈی پور سے سرینگر ہوا۔ اور ایک افسر کی مہربانی سے مجھے سیّدین صاحب کی دوصاجزادیوں، زہرہ اور بلقیس کو پڑھانے پر مامور کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے احساس ہوا کہ دونوں لڑکیاں ذہنی طور پر بہت اعلیٰ مقام پر فائز تھیں۔ اور میں احساس کمتری میں مُبتلا ہونے لگا۔ لیکن جلد ہی میں نے اِس پر قابو پا لیا۔ اس طرح سے میرا

اس گھرانے سے گہرا رابطہ قائم ہو گیا۔ اُس زمانے میں سیّدین صاحب کے ہاں پردہ شدت سے ہوتا تھا۔ اور اگر کبھی بیگم صاحب مجھ سے کچھ کہنا چاہتیں، تو وہ پردے کے اندر سے میرے ساتھ باتیں کرتیں۔ لڑکیوں کو پڑھانے کا سلسلہ چھ ماہ قائم رہا۔ اِس کے بعد وہ لوگ جموں گئے اور میں یہیں رہا۔ لیکن اِس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں بلا تکلف سیّدین صاحب کے ہاں آیا جایا کرتا اور ان سے کچھ کہنا ہوتا، تو اس میں مجھے زیادہ پریشانی نہ ہوتی۔ اِس کے بعد ایک اور واقعہ ہوا، جس نے مجھے سخت مایوس کر دیا۔ ہوا یہ کہ سرینگر کے ٹیچرز ٹریننگ سکول میں اُستاد زبان کی اسامی خالی ہوئی اور میں اپنے کو اس اسامی کا اہل سمجھتا تھا۔ میعادِ ملازمت کے اعتبار سے بھی اور تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے بھی۔ تقرّر سیّدین صاحب کے ہاتھ میں تھا اور مجھے اس سلسلے میں اُن سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، مگر بڑی تاخیر کے بعد جب احکام نکلے تو اِس جگہ پر تقرّر میرے دوست حسین علی انصاری مرحوم کا ہوا۔ وہ مجھ سے میرے خیال میں بہر حال کم مستحق تھے، مگر اس کے باوجود ایسا ہوا، اور میں نے سیّدین صاحب کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ سال بھر کے بعد انھوں نے مجھے بھی ترقی دی اور مجھے اپنے دفتر میں لٹریری اسٹنٹ کے عہدے پر فائز کیا، میرے ساتھ ایک اور دوست تھے کیف اسرائیلی، جواب نہ معلوم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اُن کے دفتر میں رہ کر مجھے براہِ راست اُن سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اُن دنوں تعلیمِ جدید کے نام سے ایک تعلیمی رسالہ نکلتا تھا اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ اس کے علاوہ سیّدین صاحب کی ساری خط

و کتابت کا کام میرے ذمے تھا۔ یہاں مجھے اُنھیں بہت قریب سے دیکھنے اور اُن کی صلاحتیوں کا اندازہ لگانے کا موقع ملا۔ اور میں رفتہ رفتہ اُن سے مرعوب ہونے لگا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ یہ شخص لگاتار کام کرتا ہے اور اس کے چہرے پر کبھی تھکن کے آثار تک نہیں ہوتے۔ دفتر میں مختلف لوگوں کے پاس الگ الگ شعبے تھے، وہ ان شعبوں کا کام کرتے کرتے بے حال ہو جاتے۔ خود میرا بھی یہی حال تھا۔ مگر سیّدین صاحب تمام کاغذات کو پڑھتے اور اُن پر احکام نافذ کرتے۔ قلمی کام جاری رہتا۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہتا۔ سمیناروں اور مذاکروں میں آتے اور بولتے، ریڈیو کے لئے تقریر لکھتے۔ غرض اُن کا ایک ایک لمحہ کام میں صرف ہوتا۔ یہاں آکر میں نے اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا۔ دفتری کام بڑا خشک ہوتا ہے۔ وہی فائلیں، وہی رٹے ہوئے نوٹ اور جُملے اور وہی انداز جو انگریزوں کی آمد کے وقت شروع ہوا تھا۔ اب بھی جاری ہے۔ مگر میں نے دیکھا، کہ یہ آدمی اِس خشک کام سے بھی تفریح طبع کا سامان بہم کرتا ہے۔ کہ ایک دفعہ یوں ہوا کہ اکاونٹنٹ جنرل نے اعتراض کیا کہ استادوں کی موجودہ تعداد منظور شُدہ تعداد سے زیادہ ہے۔ اور 15 اُستاد ایسے ہیں، جن کا بجٹ منظور نہیں ہے۔ اِس اعتراض پر بہت پریشانی ہوئی۔ اور ماتحت عملے سے پوچھا گیا، کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا، انسپکٹراں، اسسٹنٹ انسپکٹراں، ہیڈ ماسٹراں سے واقعات دریافت کئے گئے اور یہ معاملہ کئی سال چلتا رہا۔ اور اس کیس کا ایک بھاری بھرکم فائل بن گیا۔ پوری چھان بین اور تحقیقات کے بعد معلوم ہوا کہ اکاونٹنٹ جنرل

کا اعتراض بے بُنیاد ہے۔ اور اُسے دلائل و شواہد سے مطمئن کر دیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ہوا، تو پنڈت گوپی کشن نے جو آجکل سدھار سمتی کے لیڈر اور اُس زمانے میں ہیڈ کلرک تھے، فائل سیّدین صاحب کے پاس بھیجا، کہ اب یہ معاملہ ہو چکا ہے اور اعتراض باقی نہیں رہا۔ حکم صادر فرمایا جائے۔ کہ یہ فائل داخل دفتر کر دی جائے، اِس پر سیّدین صاحب نے نفیس انگریزی میں یہ نوٹ لکھا۔

"حال ہی میں ایک امریکی مزاح نگار نے امریکی پولیس پر طنز کرتے ہوئے ایک افسانہ لکھا ہے۔ اِس کا پلاٹ یہ ہے، کہ نیویارک کے شاہی اصطبل سے ہاتھی بھاگا، نیویارک کی ساری پولیس اُس کی تلاش میں نکلی۔ چھ ماہ کی تگ و دو کے بعد معلوم ہوا، کہ غریب ہاتھی اسی اصطبل کی دیوار کے پیچھے اطمینان سے مر گیا تھا۔ پھر لکھا:

So we lost 15 posts file the case.

محکمہ تعلیم کے ایک معزز معتبر اور بُزرگ پروفیسر لالہ چاندمل کچھ عرصہ کے لئے سیّدین صاحب کے پی،اے بن کر آئے۔ ایک روز جموں کے ایک برہمن نے ایک درد ناک درخواست بھیجی۔ اس میں اُس نے لکھا تھا کہ وہ ہندی اور سنسکرت کے تمام امتحانات اول درجے میں پورے اعزاز کے ساتھ پاس کر چُکا ہے۔ مگر حال ہی میں جب ہندی اور سنسکرت ٹیچروں کا انتخاب ہوا، تو اُسے نظر انداز کر دیا گیا، اور اُس کی جگہ اُس کے مقابلے میں کم تعلیم اور کم استعداد لوگوں کو بھرتی کیا گیا۔ پروفیسر چاندمل اِس درخواست سے متاثر ہوئے اور دفتری نوٹا نوٹی کے بجائے اس پر اکبر آلہ آبادی کا یہ شعر لکھا اور سیّدین صاحب کے

پاس بھیج دیا:

ہے عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
پاس تو کرتے ہیں لیکن نوکری ملتی نہیں

آدھے گھنٹے میں سیّدین صاحب نے یہ کاغذ واپس بھیجا اور اِس پر لکھا تھا۔

Not This:

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
پہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر

دفتر کے سپرنٹنڈنٹ پنڈٹ راجا رام شرما تھے۔ جو اپنی قابلیت اور خاص کر انگریزی دانی کی وجہ سے ریاست بھر میں مشہور تھے۔ پروفیسر چاندمل نے یہ کاغذ کچھ لکھے بغیر ان کے پاس بھیج دیا۔ پنڈت راجا رام نے ایک خوبصورت نوٹ انگریزی میں لکھا، جس کا مفہوم یہ تھا، کہ ڈائریکٹر کے ارشاد کے مطابق دراصل زد اس بات پر ہے کہ پڑھنا آدمی کو بے کار کرتا ہے۔ اب جو ہم لوگ پڑھ چکے ہیں، اور یہ غلطی کر بیٹھے ہیں۔ تو ہمارے لئے کیا ارشاد ہے۔ پروفیسر چاندمل نے اس پر دستخط کئے اور سیّدین صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے معاً جواب دیا:

Tell Rajaram

تُم نے جو کالج میں سیکھا ہے وہ یکسر بھول جا
کھا، ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا

اس کے بعد یہ کاغذ پنڈت گوپی کشن کے پاس گیا۔ انھوں نے یہ ساری

روداد پڑھی، اور لکھا کہ اس بیت بازی میں بچارا سایل مارا گیا اور اِس کی خوب شنوائی ہوئی۔ آخر میں اس کے تقرر کے احکام صادر ہوئے۔

دفتر میں ایک ضعیف العمر بابو بہاری لال تھے، جو اناپ شناپ انگریزی لکھتے اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا لکھ گئے ہیں۔ سیّدین صاحب بالعموم، اُن کے ڈرافٹ کاٹ دیتے اور خود اپنا مضمون لکھ بھیجتے۔ آخر ایک روز تنگ آ کر لکھ دیا۔

Doesn't Biharilal read what nonsense he writes?

سیداحمد جلالی موجودہ سپرنٹنڈنٹ جوائنٹ ڈائریکٹر گرلز ایجوکیشن اُس زمانے میں دفتر کے ریکارڈ کیپر تھے۔ ایک روز انھوں نے بے خیالی میں کسی کاغذ کے ساتھ غلط فائل رکھ دیا۔

This is not the relevent file why doesnot Jalali use his small common sense?

کسی ماتحت دفتر سے ایک کلرک ڈائرکشن آفس میں تبدیل ہو کر آئے، اُن کا پہلا ہی ڈارفٹ جو سیّدین صاحب کے پاس گیا بے ربط بے معنی اور سقیم تھا۔ سیّدین صاحب اُن کو جانتے نہ تھے۔ ڈرافٹ کو ٹھیک کیا اور نیچے لکھا:

Who is this new star on the drafting horizon of my office?

گرلز ایجوکیشن میں ایک کلرک کے خلاف اُستانی نے شکایت کی کہ کلرک نے اُس کے تبادلے کا حکم اس وقت تک اُسے نہ دیا، جب تک اُس سے دس روپے نہ لئے۔ سیّدین صاحب نے تحقیقات کا حکم دیا۔ کلرک نے کوئی جواب دینے سے انکار کیا۔ اور اصرار کرتا رہا کہ مجھے ڈائرکٹر ایجوکیشن سے ملنے دیا

جائے۔ میں ساری صورت حال خود بتاؤں گا۔ ماتحت افسران نے اس کا یہ عذُر قبول نہ کیا۔ اور اپنی رپورٹ میں ساری روداد لکھ کے سفارش کی، کہ اُسے برخاست کر دیا جائے، کیونکہ وہ جُرم کے ارتکاب سے انکار بھی نہیں کرتا۔ سیّدین صاحب کے پاس رپورٹ آئی، تو انھوں نے حکم دیا کہ اس کلرک کو میرے پاس بھیج دیا جائے۔ کچھ روز کے بعد وہ حاضر ہوا۔ اور اُس نے اپنی روداد بیان کی۔ کہا کہ اُس نے اُستانی سے دس روپے لئے ہیں۔ لیکن پسِ منظر یہ ہے کہ میری بیوی ایک بچہ چھوڑ کر آج سے بیس برس پہلے مر گئی۔ بچے کی عمر اس وقت ایک سال تھی۔ میں نے اپنی ساری زندگی اس بچے کی پرورش نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دی۔ دونوں وقت کا کھانا خود پکاتا رہا، اور بچے کو بی، ایس، سی تک پڑھایا۔ اُس نے اول درجے میں امتحان پاس کیا اور اس کے فوراً بعد اُسے ڈیرہ دون کے فارسٹری سکول میں اعلیٰ تربیت کے لئے منتخب کیا گیا۔ میرے پاس اُس کے ابتدائی اخراجات کے لئے کچھ نہ تھا۔ میں نے مکان اور سامان بیچ ڈالا اور اُسے تین ہزار روپیہ دے کر رخصت کیا، خود ایک سرائے میں گذارہ کرنے لگا۔ چھ ماہ بعد وہ واپس آیا، وہ بیمار ہو گیا اور دق کے مرض میں مبتلا تھا۔ مجھے ہر روز اُس کے معالجے پر چار پانچ روپے خرچ کرنا پڑتا تھا، جو میری اِستعداد سے باہر تھا۔ میں نے رشوت لینا شروع کیا، مگر رشوت اتنی ہی لیتا، جتنا مجھے اس بچے کے علاج کے لئے درکار ہوتا۔ اس اُستانی سے جب میں نے دس روپے کا مطالبہ کیا، تو اس روز مجھے بچے کی دوا کیلئے انھی دس روپے کی ضرورت

تھی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُستانی کو یہ دس روپے دینے پر سخت مجبور کیا۔ میں دس روپے لے کر گیا اور دوا لایا۔ دوسرے دن میرا لڑکا چل بسا۔ اُس کے بعد میں کسی سے رشوت نہیں لیتا۔ آپ مختار ہیں ، جو فیصلہ چاہیں کر دیں۔ یہ کہہ کر کلرک وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔ سیّدین صاحب کی میز پر یہ فائل کئی دن تک پڑا رہا۔ انھوں نے اس پر کوئی فیصلہ نہ دیا۔ آٹھ دس روز کے بعد خبر آئی، کہ یہ کلرک اچانک سڑک پر بے ہوش ہو کر گرِ پڑا اور مر گیا۔ سیّدین صاحب نے سُنا تو آبدیدہ ہو گئے، اُسی روز فائل نکلا ۔ اُس پر لکھا:

Some body told me this morning that the man is dead. Nil-Nisi-Dando. His account stands with his God now.

میں نے آپ سے کہا ہے ، کہ اُن کی اُردو خط و کتابت اکثر میرے ذریعہ ہوتی تھی۔ ایک روز کسی نے ان کو اُردو میں خط لکھا۔ مقصد یہ تھا کہ اُس کی نوکری لگ جائے۔ خط لکھنے والے نے سیّدین صاحب کو خُدا رسولؐ کے واسطے دئے تھے۔ اور بار بار پنجتنؑ کا ذکر کیا تھا۔ غالبًا مقصد یہ تھا کہ میں بھی شیعہ ہوں اور آپ بھی شیعہ ہیں۔ یہ خط انھوں نے میرے پاس بھیج دیا۔ اس پر لکھا تھا:

Tell this youngman that I am a muslim by chance.

چوے گویم مُسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لاالٰہٰ را

سیّدین صاحب کے دوران نظامتِ تعلیم میں وہ زمانہ بڑا صبر آزما تھا۔ جب مرزا جعفر علی خان اثرؔ کی جگہ وزیرِ تعلیم وزیر گنگا رام ہوئے۔ وزیر گنگا رام

کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت ہشیار اور سمجھدار آدمی تھے، مگر تھے ناخواندہ، اور پھر سیّدین صاحب ایسے بین الاقوامی شہرت کے عالم کے لئے یہ حادثہ، واقعی ناقابلِ برداشت ہوگا۔ خاص کر جب اُن سے پہلے وزیرِ تعلیم مرزا جعفر علی خان آثر تھے۔ اُس زمانے میں یہ لطیفہ عام طور پر مشہور تھا، کہ وزیر گنگا رام نے سیّدین صاحب سے کسی گاؤں میں ہائی سکول کھولنے کو کہا۔ سیّدین صاحب نے کہا کہ سکول میں طلباء کی تعداد بہت کم ہے، ہائی سکول کیسے کھولا جا سکتا ہے۔ تو وزیر صاحب نے جواب دیا۔ "خواجہ صاحب تُسی ہٹی کھولو۔ گاہک آپے آون گے۔" یعنی خواجہ صاحب آپ دوکان کھولیں، گاہک خود ہی آجائیں گے۔

9رفروری 1943ء کو سیّدین صاحب یہاں سے سبکدوش ہو کر چلے گئے۔ جانے سے پہلے اُنھیں بے شمار الوداعی پارٹیاں دی گئیں۔ ایک پارٹی میں پروفیسر چاندمل نے اُن کی خدمت میں ایک سُپا سنامہ پیش کیا۔ اور اس میں سیّدین صاحب کو پورے خلوص اور محبت سے خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں سیّدین صاحب نے ایک دلچسپ تقریر فرمائی۔ انھوں نے کہا، میرے دوست ڈاکٹر ہادی حسن، پروفیسر علی گڑھ یونیورسٹی اور میں ایک دفعہ ایران گئے۔ اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ واپسی پر علی گڑھ کی یونین نے مجھ سے اور ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ ایک جلسے میں ایران کے متعلق اپنے تاثرات بیان کریں۔ ہم نے قبول کیا، جلسے میں پہلے ڈاکٹر ہادی حسن بولے۔ اور میں پریشان ہونے لگا، کہ اب کیا کہوں۔ بہرحال اُن کی تقریر کے بعد میں اُٹھا اور میں نے

کہا، میرا خیال تھا، کہ میں ایران ہو آیا ہوں، مگر ڈاکٹر ہادی حسن نے اپنے زورِ کلام سے جس ایران کی تصویر آپ کے سامنے رکھی ہے، اس کو دیکھ کر مجھے یقین ہوا ہے، کہ میں ایران نہیں گیا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر ہادی حسن کا پیش کیا ہوا ایران میں نے بالکل نہیں دیکھا ہے۔ یہ واقعہ مجھے پروفیسر چاندمل کے سپاسنامے کو سُن کر یاد آیا۔ میں بھی چالیس سال سے ایک سیّدین کو جانتا ہوں، مگر جس مجموعۂ صفات سیّدین کی تصویر پروفیسر چاندمل نے آپ کے سامنے رکھی ہے۔ میں ابھی تک اُسے نہیں جانتا۔

بنیادی تعلیم کو رائج کرنے کے لئے سیّدین صاحب نے باہر سے کچھ ماہرین تعلیمات کو بُلایا تھا۔ وہ ایک سیمنار میں یہاں کے سینئر اساتذہ کو لیکچر دیتے تھے۔ اُن سے سوالات طلب کرتے اور جواب دیتے۔ خود سیّدین صاحب بھی لیکچر دیتے۔ ایک روز محکمہ تعلیم کے ایک مشہور اُستاد پنڈت دینا ناتھ در نے کوئی سوال پوچھا اور جواب جو ملا، اُسکے ساتھ انھوں نے اتفاق نہ کیا۔ سیّدین صاحب نے بے خیالی میں کہا۔ آپ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔ پنڈت دینا ناتھ در نے فوراً کہا:

If I were not here, I would have thought that you were insulting me.

سیّدین صاحب بہت نادم ہوئے اور سمینار کے بعد در صاحب کو اپنے ساتھ گھر لے گئے اور اُن سے معذرت مانگی۔

سیّدین صاحب کی ایک بیٹی کشمیر میں پیدا ہوئی اور چند روز بعد مر گئی۔

اُن کو بہت افسوس ہوا۔ مختار صاحب نے بچی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ اور بٹہ مالو میں اپنے قبرستان میں اُسے دفن کرایا۔ سنگِ مزار پر سیّدین صاحب نے لکھوایا:

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بُود

سیّدین صاحب نے سکولوں میں سال بھر میں لیبرِویک کے نام سے ایک رسم چلائی تھی۔ اس ہفتے میں اُستاد اور طلبا محلوں میں جاتے، گلی کوچے صاف کرتے اور لوگوں کو ہاتھ سے کام کرنے کی اہمیت بتاتے۔ ایک روز ہم بچوں کی ایک جماعت لے کر بٹہ مالو کے گلی کوچے صاف کر رہے تھے۔ میرے ساتھ ایک اور میرپُوری اُستاد شیر علی بھی تھے۔ سیّدین صاحب کام کا جائزہ لینے آئے۔ سب لوگ جھاڑو ہاتھ میں لے کر کوچوں کی صفائی کر رہے تھے۔ سیّدین صاحب نے شیر علی سے پوچھا کہ کہئے ماسٹر صاحب کیا ہو رہا ہے۔ شیر علی نے بداہتاً جواب دیا، کچھ نہیں جناب:

سبق شاہین بچوں کو دے رہا ہوں خاکبازی کا

سیّدین صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا، خاموشی سے چلے آئے......

......دسمبر کو جب میں نے سُنا کہ سیّدین صاحب اپنے مولیٰ سے جا ملے ہیں، تو مجھے ایک دھکا سا لگا اور معاً ذہن میں یہ شعر آیا:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے

☆☆☆

سارے گِلے تمام ہوئے اِک جواب میں

ایک ذہین اور فطین انسان کا دماغ ہمیشہ کھوج میں رہتا ہے۔ وہ رعایت پسند نہیں ہوتا بلکہ خود تحقیق کرنے کے بعد اصول اور عقائد وضع کرتا ہے۔ اس تلاش و جستجو میں اُسے مختلف مراحل اور منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ تشکیک کی وادیوں میں سرگرداں ہوجاتا ہے اور مسلسل تلاش کے بعد آخر کار ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب وہ اپنی تحقیق پر مطمئن ہوکر بیٹھ جاتا ہے۔ اس اطمینان کے دو پہلے ہوتے ہیں۔ مثبت اور منفی۔ اکثر لوگ منفی پہلو کو اختیار کر جاتے ہیں اور اپنی ذہانت اور فطانت کے باوجود راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

انسان کی سب سے بڑی تلاش، تلاشِ حق ہے۔ انسانی ذہن ایک لمحہ بھی بیکار نہیں رہتا اور ہر وقت ایک نہ ایک معبود تراشتا رہتا ہے۔ اگر اللہ کا فضل شاملِ حال ہوتو ایک روز وہ لا ادریت کی وادی سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے وجود کا

قائل ہوجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے وجود کو ثابت کرنے کیلئے دلائل سے کام لینا بیکار ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کے مقدر میں ہدایت ہو، وہ شواہد کو دلیل بنا کر وجود باری تعالیٰ کے قائل ہوجاتے ہیں۔

شمیم ایک ضرورت سے زیادہ ذہین انسان تھا اور ظاہر ہے کہ اُس کا ذہن ایک لمحے کے لئے بھی بیکار نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں اُسے سال ہا سال سے جانتا تھا۔ میری اور اُسکی عمر میں کم و بیش 25 یا 26 سال کا فرق تھا۔ مگر ذہنی طور پر وہ اپنی ظاہری عمر کے مقابلے میں بہت زیادہ بالغ تھا اور اُس کا شعور اکثر رسل و رسائل رکھنے والے پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پختہ تھا۔ اس لئے عمر کی ظاہری تفاوت کے باوجود میری اور اُس کی شناسائی صرف شناسائی تک محدود نہ تھی۔ ابتداء میں وہ میرے مذہبی رُجحان کا مذاق اڑاتا تھا اور کبھی کبھی اِن امور پر میرے اور اس کے درمیان بڑی گرما گرم بحث ہوتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ابھی تشکیک کی گھاٹیوں میں آوارہ گردی کرتا تھا اور وہ میرے اندازے کے مطابق لاادری یعنی Agnostic تھا۔ میں اُس سے مایوس نہ تھا۔ کیونکہ میں اُس کی ذہنی صلاحیتوں سے واقف تھا اور میں جانتا تھا کہ ایک روز وہ ضرور شواہد کی بنا پر اس بات کا قائل ہو جائیگا کہ کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی زبردست طاقت کا ہونا ضروری ہے اور اس طرح سے وہ اس زبردست طاقت کا قائل ہوجائیگا جسے لوگ خدا کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہے ایک روز بڑی دیر تک ہم اسمِ ذات اللہ کے معنی پر بات کر

رہے تھے۔ میں نے اُسے بتایا کہ عربی زبان میں خدا کا یہ اسمِ ذات اسلام کے وجود میں آنے سے بہت پہلے موجود تھا۔ محققین کا اندازہ ہے کہ بعثت اسلام سے پہلے یہ لفظ کم از کم چار ہزار سال پہلے عربی زبان میں موجود تھا۔ اس کے معنوں کی تحقیقات کے سلسلے میں اِن چار ہزار برس میں اُس زمانے کے علماء، فضلاء اور دانشوروں نے بہت سی دماغ سوزیاں کیں اور اکثر علماء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ اللہ کے معنی تحیّر ہے۔ خلاف معمول وہ خاموش رہا اور میں نے محسوس کیا کہ یہ بات اُس کے دل کو لگی۔

روایتی معنوں میں وہ مذہبی آدمی نہ تھا، وہ رسمی مذہب کا قائل نہ تھا بلکہ وہ رسوم اور رواج کے خلاف بڑی شدت سے بولتا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وقت کے ذہین شاعر اُمیہ ابن لصلت کے بارے میں فرمایا تھا ''اُس کا قلب مومن ہے، مگر اُس کی زبان کافر ہے'' اور اقبالؒ نے یہی مضمون نٹشے پر چسپاں کرتے ہوئے کہا تھا۔

قلبِ اومومن دماغش کافر است

میں نے محسوس کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے فقر و نظر میں ایک انقلاب آگیا ہے اور وہ ایمان کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اُس کی روح مومن تھی مگر وہ مذہب کے ٹھیکیداروں اور خدائی فوج داروں کا دشمن تھا۔ تخریب پرور، گروہ بندی اور معمولی قسم کی رسم و رسوم پر شدید اختلافات کا سخت مخالف تھا۔ اُس کی روح اُس سے بغاوت کرتی تھی اور اس سے اس کو وحشت

ہوتی تھی۔ اُن لوگوں کے خلاف اُس کی زبان اور قلم دونوں شمشیر بن کر چلتے تھے۔ ظاہر میں لوگ حکم لگاتے تھے کہ اُس کا خدائے واحد پر بھی ایمان نہیں۔

آخر وہ مرحلہ آیا جب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوا۔ وہ ایک ایسے مرض میں گرفتار ہوا جس سے جان بر ہونا ممکن نہیں۔ قدرتی طور پر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ علالت کے ابتدائی ایام میں میں اُس کے پاس آتا رہا۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ آدمی بتدریج بُجھتا جارہا ہے تو دل نے بہت سمجھانے بجھانے کے باوجود اُس کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہ کیا۔ وہ غالباً اگست 1979 میں امریکہ علاج کے لئے روانہ ہوا، تو میں نے اُسے ایک خط لکھا اور اُس میں کہہ دیا کہ میں ہنستے، بولتے اور چہکتے مہکتے شمیم کو دیکھنے کا عادی ہوں۔ ایک علیل اور بجھے ہوئے شمیم کو دیکھنے کے لئے میرے دماغ اور میرے دل کے اندر بڑی کشمکش رہی۔ مگر آخر یہی جذبہ غالب آیا کہ میں ایک جانے والے شمیم کو نہیں دیکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری شدید علالت کا علم ہونے کے باوجود میں تمہارے پاس نہیں آیا۔ اب تم امریکہ علاج کے لئے جارہے ہو۔ میری دُعا ہے کہ تم صحت یاب ہوکر واپس آو تاکہ پرانی محفلیں پھر سے آباد اور بارونق ہوجائیں۔ ضمناً میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میرا یقین ہے کہ تم خدائے بزرگ و برتر کی ذات پر اعتماد رکھتے ہو اور انشاء اللہ یہ اعتماد تمہارا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوگا۔ وہ امریکہ گیا اور وہاں سے میرے اس خط کا جواب لکھا۔ جسے میں ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ دُنیا والے بھی اس بات کے گواہ رہیں کہ وہ شمیم جواب اپنے مالک و مولی سے

جاملا ہے اس دُنیا میں بھی اپنی آزاد خیالی کے باوجود توحید باری تعالیٰ کا قائل تھا اور یہی گواہی انشا اللہ اُس کے نجاتِ آخروی کا سبب بنے گی۔ خط کا اقتباس یہ ہے:

ہوسٹن ٹیکساس

۳رستمبر ۱۹۷۹ء

محترم نازکی صاحب، اسلام علیکم

سرینگر میں اپنی طویل علالت کے دوران میں بار بار سوچتا رہا کہ آپ کبھی بھولے سے بھی میری خبر و خیریت پوچھنے نہیں آئے۔ لیکن میں نے حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہیں لایا۔ پھر عین روانگی کے وقت کسی نے آپ کا ایک خط دیا جو مجھے ہوائی جہاز میں تقریباً 20 ہزار فٹ کی بلندی پر پڑھنے کا موقعہ ملا۔ خط پڑھ کر یہ مصرع زبان پر آ گیا۔

سارے گِلے تمام ہوئے اِک جواب میں

میں نے زندگی میں بڑی بڑی لڑایاں لڑی ہیں۔ پہلے اپنے ماحول سے، پھر انتہائی غربت اور بے سروسامانی سے۔ اُس کے بعد اپنے سے چھوٹے انسانوں سے اور پھر بڑے بڑے شاہوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں سے۔ غرض زندگی کا ہر لمحہ لڑائی میں گزرا۔ لیکن آج جس لڑائی سے دو چار ہوں یہ بڑی صبر آزما اور فیصلہ کُن ثابت ہوگی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا ہوگا کہ میں ایک طرح کے مرض الموت میں مبتلا ہوں اور مجھے ادویات اور علاج و معالجے سے

زیادہ خدا ے قدوس کی قدرت اور اُسکی رحیمی ہی اس مرض کے انجام سے نجات دلا سکتی ہے۔

میں نے خدا کے وجود، اُس کی بے پناہ، لامحدود اور حیرت ناک قوّت سے کبھی انکار نہیں کیا ہے۔ اُس دور میں بھی کہ جب ایسا کرنا فیشن میں شامل تھا۔ میرے لئے ایسا کرنا اس لئے ممکن نہ تھا کہ میں نے بچپن سے ہی اُس کے ایسے ایسے مظاہر دیکھے تھے کہ اُن کو دیکھ کر اُس کے وجود سے انکار کرنا اپنے وجود سے انکار کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اُس کے معجزے دیکھے ہیں اور آج میں خود اپنے حق میں اُس کے ایک معجزے کا منتظر ہوں۔ دیکھئے میرے مقدر میں کیا ہے۔

مجھے اُمیدِ واثق ہے کہ آپ اپنی دُعاؤں میں مجھے اُسی طرح یاد کرتے ہوں گے جس طرح ایک باپ اپنے بیٹے کو ابتلا میں دیکھ کر کرتا ہے۔

والدِ محترمہ کی خدمت میں اسلام علیکم اور درخواست دُعا۔

آپ کا مخلص

☆......شمیم

شمیم آج اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ آج ایک سال سے وہ آسودہ خواب ہے اور اُس کی گھن گرج خاموش ہے۔ میں کبھی کبھی اُس راہ سے گزرتا ہوں جہاں وہ محوِ استراحت ہیں۔ تو چند منٹ اُسکی قبر پر کھڑا رہتا ہوں اور اُسکی

مغفرت کی دُعا مانگتا ہوں۔ مجھے یقین سا ہے کہ جس خدا کے وجود، اُس کی بے پناہ، لامحدود اور حیرت ناک قوّت سے اُس نے اپنی مختصر زندگی میں کبھی انکار نہیں کیا ہے، اُس نے بچپن سے ہی ایسے مظاہر دیکھے تھے کہ اُس کے وجود سے انکار کرنا اُس کے لئے اپنے وجود سے انکار کے مترادف تھا۔ وہ خدا عفو مجسم بن کر اُس کی لغزشوں کو معاف کر چکا ہوگا اور اُسے اپنے دامانِ رحمت میں ایسی پُر سکون زندگی عطاء فرمائی ہوگی کہ جو دامانِ مادر سے بھی ہزار درجہ راحت بخش اور لاکھ درجہ فرحت رساں ہے۔

آسمان اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

☆☆☆

ستاروں سے ذرّوں تک

نام بڑا دلفریب ہے اور مصنف نے کوشش کی ہے کہ کتاب کو اسم مسمّٰی ثابت کرے۔ ''ستاروں سے ذرّوں تک'' کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ ستاروں سے ذرّوں تک جاتے جاتے جو چیز بھی سامنے آتی ہے وہ شاعر کی نظر سے اوجھل نہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ کیونکہ اس کی تیز بین نگاہوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ یا اس نام کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے شاعر اس وقت تک ستاروں کی کہانیاں بہت کہہ گئے ہیں اور اب ستاروں کی اس خیالی دُنیا سے ذرّوں کی اس حقیقی دُنیا میں آجائیں جسے آج تک شاعروں نے اپنی توجہ کا مرکز بنانے کے شایاں نہ سمجھا۔ کتاب کی فہرست مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے نام کی یہ دوسری توجیہہ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے۔ ان ذرّوں میں جگن ناتھ آزاد کو سمندِ فکر پر ایڑ لگانے کے مختلف موقعے ملتے ہیں اور وہ ان ذرّوں میں اپنی

قوم اور اپنے سماج کی صحیح تصویر تلاش کرتا ہے وہ اپنے پڑھنے والے کو سب سے پہلے تذبذب کی دُنیا سے اقبال کے دو شعر سنا کر نکالتا ہے۔

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا　　اَے قطرۂ نیساں! وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

ظاہر ہے کہ جگن ناتھ آزاد ستاروں سے ذرّوں تک سفر کرتے وقت اس خیال کو نظر انداز نہیں کرتا کہ وہ ایک ایسا قطرہ ہے جس سے دلِ دریا متلاطم ہو جاتا ہے۔ وہ بادِ سحر کا ایسا جھونکا نہیں جو چمن کو افسردہ کرے۔ وہ اپنی نوا سے حریمِ ذات میں بھی شور ڈالنا چاہتا ہے اور بتکدۂ صفات سے بھی غلغلہ ہائے الاماں بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے فوراً بعد وہ میرا موضوعِ سخن کے عنوان سے رہے سہے شکوک و شبہات دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے دوست مجھ پر تنقید کرتے ہیں انہیں شکایت ہے کہ۔

میرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ　　ابر کے کیف سے مہتاب کے نظاروں سے

آزاد کو اس کا اعتراف ہے اور وہ کہتا ہے۔

یہ بجا ہے کہ مرے فِکرِ سخن کی زد میں کیونکہ
اب نہ رنگینیٔ مغرب ہے نہ ہے بادِ شمال
ظلمتیں نور سے جب دست و گریباں ہو جائیں
پھر کہاں حسن و تجلی کی لطافت کا سوال

آزاد اپنے نکتہ چین کو تسلی بخش جواب دینے کے لئے اپنے ماحول کی

تصویر کھینچ دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میں رنگینیٔ مغرب اور بادِ شمال کا ذکر کیسے کروں جب مجھے ہر چار طرف سے بے اطمینانی کا ایک کریہہ منظر نظر آتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں اور کاش تو بھی اسے دیکھ سکے کہ آدم آدم کا شکاری ہے۔ ہر وہ شخص نفرت کا پجاری ہے جس کی زبان پر اخلاص کے دعوے ہیں۔ ہر وہ انسان شیطان کا حواری ہے جو دُنیا والوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ یزداں کا پرستار ہے۔ ایک طرف سے آدمی لعل و زر میں تلتا ہے اور دوسری طرف سے ہزاروں مائیں اور لاکھوں بچے جسم اور جان کا واسطہ قائم رکھنے کے لئے در در کی ٹھوکریں کھانے اور بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب صورت ایسی ہو تو شاعر نغمۂ شادمانی گا نہیں سکتا۔ مگر وہ پھر کیا کرے گا؟ کیا وہ روئے گا کیا وہ مایوس ہو کر ماتم کرے گا، نہیں وہ روتا نہیں، ماتم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ میرا فکر ایک عالمِ نو کی تعمیر میں مصروف ہے۔

میں کہ فنکار ہوں تبلیغ بھی ہے کام مرا
مجھ کو اس بات کے اظہار سے کچھ عار نہیں

اُسے چرخ پر ایک تجلی نظر آتی ہے جس کی ضیا زمین پر چاروں طرف پھیلتی جاتی ہے۔ اس تجلی سے نور کے چشمے پھوٹے پڑتے ہیں وہ قیدِ حدود و قصور سے آزاد ہے۔ اس نے اذان و ناقوس کی آواز سُنی بھی نہیں۔ یہ نور ایک ابدی نور ہے جس میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اس نور کی کرنوں سے ایک جہانِ نو کی تعمیر ہوگی۔ یہ جہاں نو دورِ مسرت بن کر دہر کو پیرہن انصاف پہنائے گا۔ ہر طرف

خوش بختی و فارغ البالی کا دور دورہ ہوگا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں اسی دور کا منّاد ہوں۔ اسی دور کا مبلغ ہوں۔ جو دور آئے گا تو پھر مجھ سے اس شعر کی تمنا کر جہاں میرا فکر کہیں کہکشاں سے اُلجھے گا اور کبھی تاروں سے اور کبھی اس کی رفتار اتنی تیز ہوگی کہ وہ سرحدِ افلاک سے بھی گزر جائے گا۔

کہکشاں سے کبھی اُلجھے گا کبھی تاروں سے
کبھی افلاک کی سرحد سے گزر جائے گا
یہ کرے گا کبھی میخوار گھٹاؤں کا طواف
کبھی بدمست بہاروں میں سکوں پائے گا
کبھی مہتاب جمالوں میں ملے گا تجھ کو
اور کبھی زہرہ جبینوں میں نظر آئے گا

☆

پھر گلہ تجھ کو نہ ہوگا کہ مرا فکرِ جمیل
بھاگ نکلا ہے تخیّل کے سمند زاروں سے
میں نے ڈھونڈی ہے زمانے کے اندھیروں میں پناہ
دور گردوں کے دمکتے ہوئے سیّاروں سے
میرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ
ابر کے کیف سے مہتاب کے نظاروں سے

نظم بہت طویل ہے اور اندازِ بیان اتنا دلچسپ کہ ایک بار شروع کیجئے تو

ختم ہونے تک ہاتھ سے نہیں چھوٹے گی۔ ساری کتاب میں یہی تصور غالب ہے۔ کتاب میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزلوں میں بھی اسی درد کی شدت کا احساس نمایاں ہے۔ ذیل میں لکھی گئی ایک دلچسپ غزل ملاحظہ فرمایئے۔ آزاد کہتا ہے:

ہمّت نہ ہارو ہمّت نہ ہارو
میرے چمن کی زخمی بہارو
طوفاں کی موجیں للکارتی ہیں
قائم رہوگے کب تک کنارو
ذرّوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں
اَے چاند تارو! اے چاند تارو
کب تک رہوگے میرے وطن میں
بے کیف رنگو! خونی نظارو
اے آنے والے ادوارِ تاباں
میرے قلم پر سجدے گزارو
بکھرے ہوئے ہیں گیتی کے کاکل
آزاد اُٹھو اِن کو سنوارو

معلوم ہوتا ہے کہ مجروح ماحول اور زخمی سماج کو دیکھ دیکھ کر شاعر کے ذہن پر متضاد کیفیتیں وارد ہوجاتی ہیں۔ وہ اپنے چمن کی زخمی بہاروں کو دلاسا دیتا

ہے کہ وہ ہمت نہ ہاریں۔ جہاں وہ پُر امید ہے کہ کنارے زیادہ دیر تک للکارتی موجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جہاں اُسے نظر آتا ہے کہ ذرّوں کے تیور اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ چاند تارے یہ سرگوشی کرتے سنائی دیتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے۔

آزادؔ مغربی پاکستان سے ہجرت کر کے دلّی آیا ہے وہ لاہور میں پیدا ہوا۔ وہیں تعلیم پائی اور اُس نے وہیں کی ادبی محفلوں میں اپنے ذوقِ ادب کو پروان چڑھایا تقسیم ملک نے آزادؔ کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کیا اس کے کلام سے ہر جگہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُسے اپنے وطن کی یاد بُری طرح ستارہی ہے۔ تقسیم اور ہجرت کے بعد وہ غالبًا ایک بار طیارے میں لاہور گیا۔ اس سفر کے تاثرات اس نے سیرِ پاکستان کے عنوان سے چند رُباعیوں میں ظاہر کئے ہیں۔ طیّارے سے خطاب کر کے کہتا ہے۔

گزرے ہوئے دور کو بُلانے والے
بچھڑی ہوئی دُنیا سے مِلانے والے
اللہ تجھے اور سُبک بال کرے
اے مجھ کو وطن میں لے جانے والے

جب وہ اپنے وطن پہنچا تو اس کے تاثرات کچھ اس قسم کے تھے۔

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا
مہجورِ وطن وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن! چمن میں اعلان کرو
شیدائے چمن چمن میں واپس آیا

معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے احباب نے آزؔاد کو سر آنکھوں پر بٹھایا جب وہ واپس آیا تو اس قسم کے تاثرات لے کر آیا۔

گزرے ہوئے دن یاد دلانے والو
ہشیار کو دیوانہ بنانے والو
آزؔاد کو گفتگو کا یارا ہی نہیں
آزاد کو آنکھوں پہ بٹھانے والو
مانا کہ اُسے درد سے آزاد کیا
تسلیم کہ ناشاد کو دل شاد کیا
آزؔاد کو رکھا نہ کہیں کاتم نے
یوں لطف وکرم سے اُسے برباد کیا

آزؔاد ان ادیبوں میں سے ہیں جو اُردو کو ہندو اور مسلمان دونوں کی ملی جلی تہذیب کی یادگار سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ دشمنی کرنے والوں کو مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے دشمن قرار دیتے ہیں۔ دو ایک رُباعیاں ملاحظہ ہوں۔

سرشار کا حسنِ داستاں ہے اُردو
محروم و فراق کا بیاں ہے اُردو
اُردو کو ملیچھ کیوں سمجھتے ہو تم
چکبست و سرور کی زباں ہے اُردو

☆

اے اہلِ وطن یہ داستاں اپنی ہے
اپنی ہے یہ رودادِ فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹا رہے ہو اے دیوانو
غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے

☆

اردو ہے فقط زبان کہسار نہیں
اِک موجِ شمیم ہے یہ تلوار نہیں
مشکل نہیں اردو کا مٹانا لیکن
کیا اپنے تمدّن سے تمہیں پیار نہیں

☆☆☆

WARAQ WARAQ ROSHAN

Mir Ghulam Rasool Nazki

Printed at:
Mehak Printing Press, Sgr. #9419063159